

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اہل السنۃ والجماعۃ

تحریر خلدون عصر

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی

مجلس نشریات اسلام

۱۔ کے۔ ۳ ناظم آباد مینشن ناظم آباد۔ کراچی ۱۵

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

اہل السنۃ والجماعۃ

اصطلاح کی لغوی و معنوی تشریح، اس کا تاریخی تعین، مذہب کے اصولِ اولین کی تحقیق اور منقول و منقولہ اصولِ تطبیقی پر توضیح

تحریر، خلدون عصر

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

۱۳۷۳ھ

مجلس نشریات اسلام

۱۔ کے ۳۔ ناظم آباد ۱۔ کراچی ۱۵

پاکستان میں جملہ حقوق طباعت و اشاعت
بحق فضل ربی ندوی محفوظ ہیں

باجازت خصوصی علامہ مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر سید سلمان ندوی صاحب

نام کتاب	_____	اہل السنۃ والجماعۃ
تصنیف	_____	علامہ سید سلیمان ندویؒ
طباعت	_____	شکیل پرنٹنگ پریس کراچی
اشاعت	_____	۱۹۹۶ء
صفحات	_____	۱۰۰ صفحات
ٹیلیفون		
۶۲۱۸۱۶		

ناشر
فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام اے۔ ۳۰ ناظم آباد منشن، ناظم آباد کراچی۔ ۲۶

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان
۷	دیباچہ
۸	ایک سوال
۹	تہمید
۹	سنت و جماعت
۱۰	بدعت
۱۲	صلاح کے بعد فساد کیسے ہوتا ہے؟
۱۵	جماعت کا فلسفہ
۱۹	اسلام میں جماعت شکنی
۲۳	اختلاف صحابہ اور مختلف فرقوں کی پیدائش
۲۴	اہل السنۃ یعنی ناظر فدا رگروہ
۲۸	اہل سنت کلام میں
۲۸	عرب اور عجم کے خصائص ذہنی
	کوفہ اور بصرہ کے شہر کیوں
۲۹	اختلافات کا مرکز بنے؟

صفحہ	عنوان
۳۰	مشاجرات صحابہ کے بعد اختلاف افکار
۳۰	اہل السنۃ کا فیصلہ
۳۳	فروق کی ملکی تقسیم
۳۳	بنو امیہ کے دور میں مذہبی فرقوں کا ظہور
۳۵	فروق کا انتشار
۳۹	ضلالت کے طبعی اسباب
۳۹	خیال آرائی
۴۰	عقائد میں وسعت طلبی
۴۱	تاویل متشابہات
۵۳	اشاعرہ، حنابلہ اور ماتریدیہ
۵۸	قدماء کے نزدیک اہل سنت کے معنی
۶۰	مسئلہ تقدیر یا جبر و قدر
۶۱	صفات
۶۲	قرآن
۶۴	استواء

صفحہ	عنوان
۷۶	بعض شبہات کا ازالہ
۸۰	اہل السنۃ کے عقائدِ صحیحہ
۸۰	عقائد کی افادیت
۸۱	اہل سنت کے عقائد
۹۷	ضمیمہ
۹۷	تشریح اصطلاحات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

یہ رسالہ ایک مسلسل مضمون کی شکل میں پہلے معارف میں شائع ہوا تھا، بعد کو ۱۹۱۵ء میں یا اس کے پس و پیش احباب کے اصرار سے الگ رسالہ کی صورت میں چھپا، اور مقبول ہوا مدت سے یہ ناپید تھا، اور احباب کا تقاضا تھا کہ یہ دوبارہ چھپے، مگر چونکہ وہ عہد شباب کا لکھا ہوا تھا اس میں قلم کی تیزی، اور کہیں لہجہ کی شدت، اور کہیں عبارت میں شوخی تھی اس لئے جی چاہتا تھا کہ اُس پر نظر ثانی کی جائے، بحمد اللہ کہ یہ فرصت کراچی میں ملی، اقد کھلی تحریر میں حک و اصلاح کی گئی، اور آخر میں عقائد کی افادیت اور عقائد کی تفصیل کا اضافہ کیا گیا، تاکہ عام مسلمان اہل سنت کے صحیح عقائد سے واقف ہوں،

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے مسلمانوں کو مستفید فرمائیں،

آمین

والسلام

سید سلیمان ندوی

دارالحکومت کراچی

۲، شوال ۱۳۵۱ھ

ایک سوال

قوموں ہلکوں اور ممتاز افسر اداسانی کی تاریخ بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ وہ کیا تھے اور کیا ہو گئے لیکن کبھی اس پر بھی تم نے غور کیا کہ الفاظ کی بھی کوئی تاریخ ہو سکتی ہے؟ کیا قوموں، ملکوں اور انسانوں کی طرح ان میں بھی انقلابات کا مد و جزر ہے جس سے دنیا کا ایک ذرہ بھی مستثنیٰ نہیں؟“

(حضرت علامہ ندویؒ)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ
الْمُرْسَلِينَ وَآلِهِ وَاصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ،

تہم سید مسلمانوں میں ہر دور میں سیکڑوں فرقے پیدا ہوئے،
لیکن وہ نقشِ بر آب تھے، اُبھرے اور مٹ گئے، لیکن جو فرقہ عموم اور
کثرت کے ساتھ باقی ہے، اور آج مسلمان آبادی کا اکثر حصہ بن کر
اکنافِ عالم میں پھیلا ہے وہ فرقہ ”اہل سنت والجماعت“ ہے، عام طور
سے اہل سنت کے معنی ہندوستان میں یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو شیعہ نہ
ہو، لیکن یہ اس کا اثباتی پہلو نہیں ہے، یہ تو منفی پہلو ہے۔ ضرورت
ہے کہ اس کی حقیقت کو پوری طرح سمجھا جائے۔ اس لیے ہم کو اہل السنۃ
والجماعت کے ایک ایک لفظ کے معنی پر غور کرنا چاہیئے۔

سنت و جماعت: ”اہل سنت والجماعت“ میں لفظوں سے
مرکب ہے، اہل کے معنی اشخاص، متقلدین، اتباع اور پیرو کے یہاں
ہیں ”سنت“ عربی میں راستہ کو کہتے ہیں اور مجازاً اصول مقررہ، روش
زندگی اور طرز عمل کے معنی میں یہ لفظ آتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں یہ
لفظ متعدد دفعہ انہیں معنوں میں آیا ہے، فرمایا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا، اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ

نہ پاؤ گے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَحْوِيلًا، اللہ کی سنت میں تم تبدیلی نہ پاؤ گے
 سُنَّةَ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ، ان کا راستہ جو پہلے گزرے،
 اسی طرح احادیث میں سنت کا جو لفظ آتا ہے، اس کے معنی حضور انور
 علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصول مقررہ اور طرزِ عمل کے ہیں۔ اسی لئے
 اصطلاحِ دینی میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرزِ زندگی اور
 طریقِ عمل کو ”سنت“ کہتے ہیں۔ جماعت کے لغوی معنی تو گروہ کے ہیں،
 لیکن یہاں جماعت سے مراد جماعت صحابہؓ ہے، اس لفظی تحقیق سے
 ”اہل سنت والجماعۃ“ کی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے، یعنی یہ کہ اس فرقہ
 کا اطلاق اُن اشخاص پر ہوتا ہے جن کے اعتقادات اعمال اور مسائل
 کا محورِ پیغمبر علیہ السلام کی سنتِ صحیحہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اثر مبارک
 ہے، یا یوں کہنے کے جنہوں نے اپنے عقائد اور اصولِ حیات اور عبادات
 اخلاق میں اس راہ کو پسند کیا جس پر رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام عمر بھر
 چلتے رہے، اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ اُس پر چل کر منزلِ مقصود
 کو پہنچے۔

بدعت : ”سنت“ کا مقابل لفظ ”بدعت“ ہے، بدعت کے لغوی
 معنی نئی بات کے ہیں، اصطلاحِ شریعت میں اس کے یہ معنی ہیں کہ مذہب
 کے عقائد یا اعمال میں کوئی ایسی بات داخل ہو جس کی تلقین صاحبِ نبیؐ

نے نہ فرمائی ہو، اور نہ اُن کے کسی حکم یا فعل سے اس کا منشاء ظاہر ہوتا ہو، اور نہ اس کی نظیر اس میں ملتی ہو، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے ان دو لفظوں کو انہیں معنوں میں مستعمل فرمایا ہے، اور کبھی "سنت" کے بجائے "ہدیٰ" اور بدعت کے بجائے "محدث" فرمایا ہے لغت میں بھی یہ الفاظ مترادف ہیں، ہدیٰ طریقہ کو کہتے ہیں، اور محدث کے معنی "نیا"۔

صحیح مسلم میں آپ کا وہ خطبہ مذکور ہے جس کو دیتے ہوئے آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں، آواز بلند ہو جاتی تھی، اور لہجہ غضبناک ہو جاتا تھا۔

بعد اس کے بہترین کلام خدا کا کلام ہے
اللہ وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ
سُرُّ الْأُمُورِ مُحَمَّدَانَا هَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ
بہترین طریقہ محمد کا طریقہ ہے۔ بہترین امور
نئی باتیں ہیں، اور ہر نئی بات گمراہی ہے۔
مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے۔

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ
الرَّاشِدِينَ تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَصُوا
عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَإِيَّائِمُ وَمُحَدَّثَاتِ
الْأُمُورِ فَإِنَّ كُلَّ مُحَدَّثَةٍ بِدْعَةٌ وَ
كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ
میرا طریقہ اور میرے ہدایت یافتہ جانشینوں
کا طریقہ اختیار کرو، اس کو اچھی طرح
پکڑے رہو، اور اس کو دانت سے دبائے
رہو، ہاں نئی باتوں سے بچنا، ہر نئی
بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے،

ابوداؤد، ترمذی، اور ابن ماجہ میں ہے۔

ایاکم والمحدثات فان کل محدثہ نئی باتوں سے بچنا، ہر نئی بات مگر ہی
علاۃ، ہے۔

اس قسم کی روایتیں حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ہیں، ان
روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "نئی بات" کا لفظ استعمال
فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل دوسرے موقعوں پر آگئی ہے، بخاری اور مسلم
دونوں میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

من احدث فی امرنا هذا ما لیس ہمارے اس مذہب میں یا تسلیم میں جو
منہ فہو ساد، ایسی نئی بات داخل کریگا جو اس میں نہیں
تو وہ بات مردود ہے،

صحیح مسلم میں ہے۔

من عمل عملا لیس علیہ امرنا جو کوئی ایسا کام کرے گا جس پر ہمارا
فہود مذہب نہیں وہ رد ہے۔

ابوداؤد میں بایں الفاظ ہے۔

من صنع امرأ علی غیر امرنا فہو جس نے ہمارے عمل یا مذہب کے
ساد، خلاف کوئی کام کیا وہ رد ہے۔

ان احادیث سے یہ واضح ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو
تعلیم دنیا میں لائے، جن عقائد کی تین آیتیں آپ نے اپنی امت کو فرمائی، مذہب

کا جو طریقہ عمل آپ نے منعین فرمایا اس میں باہر سے اضافہ بدعت ہے، اس سے بدعت کی حقیقت ظاہر ہوئی، اور وہ یہ ہے کہ بدعت دین حق کے اندر کسی ایسی چیز کا باہر سے اضافہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اور بتائے ہوئے دین میں نہیں، نہ اس کی اصل موجود ہے اور نہ اس کی نظیر موجود ہے، اور نہ وہ قرآن و حدیث سے مستنبط ہے، اور چونکہ دین کے ہر کام میں اجر اور ثواب کا وعدہ ہے اس لیے جب کسی چیز کو دین یا داخل دین سمجھا جائے گا تو اس پر ثواب بھی مرتب سمجھنا ضروری ہے، اس لیے اگر کوئی چیز بدعت ہو تو یقیناً وہ ثواب سے خالی ہوگی، بلکہ بوجہ اس کے مردود ہونے اور ضلالت ہونے کے اس کے کرنے سے ثواب کے بجائے گناہ ہی ہوگا، اب غور کیجئے کہ مسلمانوں کے عقیدوں میں اعمال میں، عبادات میں اور غنی و شادی و تقریبات میں جو مراسم ثواب سمجھ کر ادا کیے جاتے ہیں وہ کہاں تک موجب ثواب ہو سکتے ہیں۔

اس تشریح سے ظاہر ہوا کہ کسی امر کے بدعت قرار پانے کیلئے ضروری ہے کہ وہ اضافہ امور دین میں ہو، اگر وہ امور دین سے نہیں ہے تو نہ ہی حیثیت سے اس کو بدعت نہیں کہیں گے، مثلاً کسی نئی طرز کی کوئی عمارت بنائے، کوئی نئی مشین بنائے، کوئی نیا آلہ ایجاد کرے، ہائینس کے کسی مسئلہ کی نئی تحقیق کرے، کوئی نیا طریقہ علاج ایجاد کرے، وغیرہ

برعت کی پہچان یہ ہے کہ اس کا کرنے والا اپنے اس کام میں ثواب کا اعتقاد کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی کام میں ثواب یا عذاب کا ہونا عقل سے دریافت نہیں ہو سکتا، اس کی دریافت کی راہ صرف ایک ہے، اور وہ وحی نبوی ہے۔

صلاح کے بعد فساد کیسے ہوتا ہے: کسی قوم میں اصلاح کے ظہور کے بعد فساد کا کیوں کر راہ پاتا ہے، شارع اسلام علیہ الوفاء التحیۃ والسلام اس سے بے خبر نہ تھے فرمایا۔

ما من نبی بعثہ اللہ الا کان لدن من
امۃ حواریون، واصحاب یا خذون
اس کے چند خاص اُتباع اور پیروئے جو
بسنہم، ویقتدون بامرہ، ثم انھا
اس کی سنت کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے
تخلف من بعدہم خلوف، یقولون
غریب کی اقتدا کرتے ہیں پھر ان کے بغیر ایسی
مالا یفعلون، ویفعلون مالا یومرون
آتی ہیں جو کہتی ہیں وہ کرتی نہیں اور کرتی ہیں
من جاہدہم بیدہ فہو مومن و
وہ جس کا انکو حکم نہیں دیا گیا، جو ان سے چلنے والا
من جاہدہم بقلبہ فہو مومن و
سے جہاد کرے وہ مومن ہے جو زبان سے
لیس وراذالک من الایمان جتہ
جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو دل سے جہاد
خرد دل (مسلم) کرے وہ مومن ہے، اس کے بعد رافی برابر

ایمان نہیں، (مسلم)

اس سے ظاہر ہوا کہ نبی اپنے معجزانہ اثر اور فیض تعلیم سے اپنے

صحبت یافتوں کی ایک جماعت چھوڑ جاتا ہے، جو اپنے نبی کے طور و طریق اور سنتِ سنیت کی پورے طور پر متبع ہوتی ہے، اور ان کے بعد رفتہ رفتہ ایسے افراد ان کی جگہ لیتے ہیں جو اپنے نبی کی سنت اور طور و طریق سے دور ہوتے جاتے ہیں، اور وہی نبی ای کا باعث ہوتے ہیں۔

جماعت کا فلسفہ، اسلام کے اس حکم قطعی کے بعد کہ صاحبِ شریعت کی تعلیمات اور احکام پر کسی قسم کا اضافہ کرنا یا ان میں سے کسی جز کو ساقط سمجھنا "سنت" کی بیخ کنی اور "بدعت" کی پرورش ہے، اہل السنۃ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے بعد "الجماعۃ" کا لفظ سامنے آتا ہے اس لیے "الجماعۃ" کی تفسیر بھی خود صاحبِ شریعت کی زبان سے سن لینی چاہیئے۔

اسلام دنیا کے تفرقوں کو مٹا کر تمام دنیا کی ایک عمومی برادری قائم کرنے آیا تھا۔ وہ آیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ اس نے عرب کے متفرق قبائل کو جو باہم دشمن یا کم از کم نا آشنا تھے، ان کی قبائلی تقسیم کو مٹا کر صرف "جامعۃ اسلام" کے ایک رشتہ میں ان کو باہم متحد کر دیا مہاجرین و انصار میں وہ اخوت پیدا کر دی کہ نفسی برادریاں اس کے آگے پہنچ ہو گئیں۔

کسی قوم میں کوئی ترقی اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک اس کے تمام افراد کسی ایک نقطہ پر باہم اس طرح مجتمع نہ ہو جائیں

کہ وہ نقطہ اجتماع انکی زندگی کا اصلی محور بن جائے، اس کا تحفظ، اس کی بقاء، اس کا وجود تمام افراد قوم کی زندگی کی غرض اصلی بن جائے، اُس وقت اس مجموعہ افراد کو ایک ملت کہا جاسکتا ہے، اور وہی نقطہ اتحاد ان کا شیرازہ قومیت، رشتہ جامعیت اور رابطہ وحدت قرار پائے گا، کسی قوم کی تباہی کا اصلی سبب یہی ہوتا ہے کہ اس کی قومیت کی یہ گرہ کھل جاتی ہے۔ تمام مجتمع افراد اس طرح متفرق و منتشر ہو جاتے ہیں کہ ہوا کا ایک ادنیٰ تھوڑا کان کو بکھیر دیتا ہے۔

یورپ کے تمام متمدن ممالک کا وجود "جامعہ وطنیت" کے اندر پوشیدہ ہے۔

ہندوستان کی ترقی کی تمام کوششیں اُس وقت تک

بے اثر رہیں گی، جب تک اس کی تمام قوموں میں مذہب، یا

وطن، یا زبان کسی چیز کا نقطہ اتحاد نہ پیدا ہو۔ اسلام نے اپنے سامنے

دنیا کی عمومی برادری رکھی ہے، وہ کسی ایک وطن کو، یا کسی خاص جغرافی

ملک کو صرف باہم متحد ہی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ تمام دنیا کو متحد کر دینا

چاہتا ہے، تاکہ دنیا میں ایک عام امن و سلامتی پیدا ہو جائے، موجود

جنگ کے مصائب اسی غلطی کے نتائج ہیں، یورپ کا رشتہ اتحاد

وطن یا نسل ہے۔ جس کا اشمال لامحالہ صرف ایک محدود نسلی یا جغرافی

ملک پر ہوگا، اس لئے یورپ میں سیکڑوں جامعیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔

اس وقت انگریز جرمن سے نہیں لڑ رہا بلکہ انگلستان جرمنی سے لڑ رہا ہے۔

اسلام نے جغرافی اور نسلی امتیازات کو جن کے اندر کبھی تمام دنیا نہیں سما سکتی مٹا کر مذہب کو جامعۂ ارتباط اور رابطہ جامعیت قرار دیا، تاکہ دنیا کے جس حصہ اور انسانوں کی جن نسلوں تک بھی اس کا دائرہ وسیع ہو وہ ایک برادری کے اندر داخل ہو جائیں۔

اسلام نے باآواز بلند کہا،

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (حجرات) مسلمان تو آپس میں "بھائی بھائی" ہیں۔

اسلام کے پیغمبر نے اس کی تفسیر میں کہا۔

تروی المؤمنین فی تواضعهم وتوادم مسلمان باہمی رحم، محبت اور مہربانی میں
کشل الجسد اذا اشتكى عضو تداعى اىک بدن کی طرح ہیں، دیکھو کہ ایک عضو
لہ سائر الجسد بالسهر والحمى۔ کو بھی درد ہوتا ہے تو تمام بدن بے خوابی،

اور آپ کی دعوت ایک دوسرے کو دیتا،

(بخاری و مسلم)

پھر فرمایا

تمام مسلمان مثل ایک دیوار کے ہیں جن
کے ایک حصے سے جڑا کہ دوسرے مستحکم ہو جائے،

المومن للمومن كالبنیان، یشد

بعضہ بعضاً،

ارشاد ہوا

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اس

المسلم اخو المسلم لا یظلم ولا

یَسْلَمُ (بخاری و مسلم) پٹسلم کرے اور نہ اس کی امانت ترک کرے

آپ نے فرمایا،

كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ مَدْمَدٌ و ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان پر نفاذ چیزیں

مالہ و عرمنہ (مسلم) حرام ہیں اسکا خون اس کا مال اور اس کی آبرو

ایک دفعہ آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

انصر اِخاك ظالماً او مظلوماً اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو

صحابہ میں سے ایک نے عرض کی مظلوم ہو تو مدد کروں گا لیکن ظالم

ہو تو کیوں کر مدد کروں، فرمایا، اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے باز رکھو۔

امت اسلامیہ کی اجتماعی زندگی کی نسبت فرمایا۔

ان الله لا يحمي امتي على الضلالة اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر مجتمع نہ کرے گا

وید الله علی الجماعۃ ومن شذذ خدا کا ہاتھ جماعت پر ہے جو جماعت سے

شذذ فی النار (ترمذی) الگ ہوا وہ دوزخ میں الگ ہوا (ترمذی)

تفترق امتی علی ثلاث وسبعین میری امت تین تین فرقوں پر منقسم ہوگی بہتر

ملۃ وثنائت وسبعون فی النار دوزخ میں اور ایک جنت میں اور

واحدۃ فی الجنة وھی الجماعۃ وہ جماعت ہوگی،

انہیں معنی کی اور بہت سی حدیثیں مروی ہیں، ان سے

”اہل السنۃ“ کے بعد ”الجماعۃ“ کی حقیقت واضح ہوتی ہے، قرآن پاک

کی اس آیت

وَأَعِظُوا بِحَدِيثِ اللَّهِ جَمِيعًا، اللہ کی رستی کو سب مل کر مضبوط پکڑو،

کی یہ سب تفسیریں ہیں، قرآن پاک کی ایک دوسری آیت ہے،

وَلَا تَبْتَغُوا السَّبِيلَ فَتَنَاقَى بَيْنَكُمْ اور نہ چلو کئی راہیں، پھر وہ تم کو ہٹا دیں گی

عَنْ سَيِّدِهِ (انعام ۱۹) اللہ کی راہ سے،

اس آیت کی شرح اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں مضمون

ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھی لکیر کھینچی،

اور پھر اس کے دائیں بائیں لکیریں کھینچیں، اور فرمایا کہ یہ سیدھی لکیر

تو صراطِ مستقیم ہے اور داہنے بائیں کی اسوا (نفسانی) ہیں، بعض دفعہ

صحابہ نے پوچھا، یا رسول اللہ وہ صحیح راہ کیا ہے، فرمایا،

مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي وہ وہ ہے جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں

اسلام میں جماعتِ شکینی؟ اسلام میں "سنت" اور جماعت

میں سے سب سے پہلے جماعت" کا اصول ٹوٹا، اس جماعتِ شکینی

نے سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا،

یعنی عثمانیہ اور سبائیہ۔

یہ فرقے خود صحابہ کے اخیر عہد میں پیدا ہو چکے تھے، سب سے

پہلے حضرت عثمانؓ کے ملکی طرزِ عمل اور سیاسی انتظامات کی بنا پر دو فرقوں

کا ظہور ہوا، ایک ان کا حامی اور طرفدار تھا، اور دوسرا ان کا مخالف تھا،

پہلا فرقہ تاریخ میں عثمانیہ کہلاتا ہے، اور دوسرے کا نام سبائیہ

ہے، ابن سبا ایک یہودی نو مسلم تھا، جس نے حضرت عثمانؓ کے مخالفین کو ایک شیرازہ میں مجتمع کیا تھا، عثمانیہ خالص عرب تھے۔ سبائے میں عرب و عجم دونوں عنصر شامل تھے، ان دونوں قوموں کے خصائص طبعی بالکل مختلف ہیں، عرب تلوار کے دھنی ہیں اور اہل عجم باتوں باتوں میں کام نکالنے کے عادی ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دو ہی میدانوں کے بعد یہ فرقہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا، ایک نے اپنے لئے علویہ یا شیعی علی کا لقب پسند کیا، اور دوسرا خوار ساج کے نام سے مشہور ہوا، پہلے ان کو عموماً حروریہ کہا جاتا تھا، (حرور ایک مقام کا نام تھا، جہاں اس فرقہ نے اپنی علیحدہ ہستی کا سب سے پہلا اعلان کیا، یہ تمام تر عرب تھے، اور نظریہ سابق کے مطابق اس نے اپنے دعوؤں کا دو ڈھائی سو برس تک ہمیشہ تلواروں کے ذریعہ سے اعلان کیا اور کبھی اس نے خلفائے عہد کے سامنے سرِ اطاعت خم نہ کیا۔

علویہ میں عرب کمتر لیکن اہل عجم کا بڑا حصہ شامل تھا اسی لئے آخر الزکوٰۃ عنصر میں تلوار کے بجائے سازشوں کا مادہ فطرۃ زائد تھا، اور جو عرب تھے وہ اپنی وفاداری پر قائم رہے انصار کا ایک حصہ علوی تھا اور بعض محدثین بھی علوی تھے یعنی حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ سے افضل جانتے تھے۔

فرقہ عثمانیہ سو برس تک نبو امیہ کی زندگی کے ساتھ قائم رہا

بعض بعض صحابہ اور بعض اکابر محدثین اس فرقہ میں داخل تھے، اسما الرجال میں بعض محدثین کے حالات کے ضمن میں اس کی تصریح ملتی ہے، کہ وہ عثمانی یا علوی تھے، لیکن بنو امیہ کے زوال کے بعد اس فرقہ کا نام و نشان تک نہ رہا۔

ان فرقوں نے تھوڑے دن کے بعد ملک کی جغرافیائی تقسیم کر لی، عثمانیہ، شام میں، علویہ اور حروریہ عراق میں، اور اہل السنۃ حجاز میں۔ ابتداء عثمانیہ اور علویہ میں صرف اسی قدر فرق تھا کہ عثمانی حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ سے افضل سمجھتے تھے، اور علویہ حضرت علیؓ کو ان سے بہتر جانتے تھے۔ شیخین کی فضیلت پر دونوں کو اتفاق تھا، لیکن رفتہ رفتہ عثمانیہ ناصبیہ ہو گئے، یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علی الاعلان نفوذ باللہ برا کہنے لگے لامحالہ اس کا رد عمل ہونا ضرور تھا، علویہ نے نہ صرف بنو امیہ کو ملکہ خلفائے اولین کو بھی برا کہنا شروع کیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ علویہ کا یہ فعل بہت بعد میں شروع ہوا، کیونکہ صحاح کی کتابوں میں بنو امیہ کی ان شرارتوں، اور خوارج کی بدعتیہ گئیوں کی تردید صحابہ کی زبان سے مصرح مذکور ہے، لیکن علویہ کی نسبت ان کا کوئی حرف میری نظر سے نہیں گذرا۔

ہم نے لکھا ہے کہ ان سیاسی اختلافات نے مذہبی اختلافات کی بنیاد قائم کی، سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوا کہ جو لوگ جنگ

جمل وصفین وغیرہ میں ادھر یا ادھر سے شریک ہوئے اُن میں برحق کون تھا، اور آیا دوسرا فریق اس آیت کا مستحق ہے یا نہیں۔
 وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءُ ۖ
 جہنم حالِ اِنھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

یہ اختلاف سب سے پہلے کوفہ میں پیش آیا، اور یہیں سے یہ صدا بلند ہوئی، صحابہؓ زندہ تھے، سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آئے، اور پوچھا کہ کیا یہ آیت منسوخ ہے؟ فرمایا نہیں، یہ آخری آیتوں میں ہے (مسلم کتاب التفسیر) خوارج اس کے قائل تھے کہ چونکہ طرفین نے ایک دوسرے پر جان بوجھ کر تلوار اٹھائی، اس لئے دونوں جہنمی ہیں، چنانچہ اسی اصول کی بنا پر ان تمام خانہ جنگیوں میں وہ دونوں جماعتوں کو برابر کا کافر جانتے تھے، اور چونکہ قتلِ عمد گناہِ کبیرہ ہے اور اس کے لئے خدا نے دائمی جہنم کی دھمکی دی ہے جو کافروں کی سزا ہے۔ اس سے وہ ثابت کرتے تھے کہ گناہِ کبیرہ کے ترکیب مومن نہیں ہیں، یہ آیت بظاہر خوارج کے اثباتِ مدعا میں ایسی صاف تھی کہ خوارج اپنے خیالات کی اشاعت میں اس سے کامیاب ہوتے تھے، مسلم میں روایت ہے کہ چند تابعین خوارج کے دلائل سے مطمئن ہو کر فارحی بن گئے تھے اتفاق سے حج کا زمانہ پیش آیا اور اُن کا مدینہ میں گذر ہوا، مسجد نبوی میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ

ایک مشہور صحابی اپنے حلقہ کو درس دے رہے تھے، اُن لوگوں نے اپنے شکوک اُن کے سامنے پیش کیے، انہوں نے تشفی کر دی، اور ایک کے سوا سب لوگوں نے اپنی سابق رائے سے توبہ کر لی۔

دوسرے فرقوں کے سامنے قرآن مجید کی دوسری آیت تھی۔

وَإِنْ كَانَتْ بَيْنَکُمُ الْفِتْنَةُ فَاصلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ
بَغَتْ أَحَدُهُمَا عَلَى الْأُخْرَى
فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِي
إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ (حجرات)

اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم کشت خون
کریں تو اُن کے درمیان صلح کرادو، اور اگر
اُن میں سے ایک دوسرے پر ظلم کرے تو
ظالم جماعت سے لڑو، یہاں تک کہ وہ حکم الہی
کی طرف رجوع کرے، (حجرات)

علوی اور عثمانی دونوں اس آیت کو اپنے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے تھے، وہ خود کو برحق ٹھہرا کر دوسرے فریق کو برسرِ باطل قرار دیتے تھے، اور اس لیے اس پر تلوار اٹھانا جائز سمجھتے تھے۔

اتنے توبہ پروردوں کے اٹھنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ
اہل السنۃ والجماعۃ کی حقیقت پر ایک اور نقطہ نظر سے غور کیا جائے
اختلافات صحابہ اور مختلف فرقوں کی پیدائش عثمان
ذی النورین کے زمانہ کے فتنہ سے لے کر اس وقت تک تین فرقے
برابر برابر کے قائم ہو گئے تھے، علویہ، عثمانیہ، حروبیہ یا خوارج، ان کی

تعداد تمام ملک میں محدود تھی، یہ تینوں فرقے جس اصلِ عظیم، جس صراطِ مستقیم، اور جس شاہِ قدیم کو چھوڑ کر الگ الگ راستوں پر پڑ گئے تھے، اسی کا نام "سنت" اور اسی کا نام "جماعت" تھا، اور جو سوادِ اعظم اس راہ پر قدم زن تھا وہی "اہل السنۃ والجماعۃ" تھے، جنہوں نے ایک طرف مذہبی حیثیت سے ان اصول سے جنگی شارع نے تعلیم کی تھی۔ ایک ذرہ ہٹنا گوارہ نہیں کیا، اور دوسری طرف انتظامی و سیاسی نقطہ سے عامہ صحابہ، سوادِ اعظم، جمہور اور جماعت کی رائے کے پابند تھے ان تمام خانہ جنگیوں میں کچھ لوگ امیر معاویہ کے ساتھ تھے، وہ عثمانیہ تھے کچھ جناب علی مرتضیٰ کے ساتھ تھے۔ وہ علویہ تھے، اور کچھ دونوں کو بُرا جانتے تھے، وہ حموری اور خوارج تھے، اہل السنۃ وہ تھے جو دونوں میں سے کسی کو بُرا نہیں کہتے تھے اور ان کی اصل نیت پر حملہ نہیں کرتے تھے، انکی حیثیت ان تمام خانہ جنگیوں میں ناظرِ جماعت کی تھی، اس لئے "اہل السنۃ" کسی فرقہ کے طرفدارِ گروہ کا نام نہ تھا، بلکہ ناظرِ دارِ گروہ کا نام تھا، وہ ان خانہ جنگیوں کو مذہبی جنگ نہیں، بلکہ سیاسی جنگ سمجھتے تھے، وہ اس کو فتنہ کہتے تھے، اور اس کی شرکت پر عدم شرکت کو ترجیح دیتے تھے۔

اہل السنۃ یعنی ناظرِ دارِ گروہ: صحابہ کبار میں سے انے خانہ جنگیوں کے عہد میں ہزاروں صحابہ زندہ تھے، لیکن فریق کی حیثیت سے جن کا نام پیش کیا جاسکتا ہے وہ معدودے چند اشخاص تھے، بقیہ

سوادِ اعظمِ ناظرِ فداری کی حالت میں تھا، جو بعض اشخاصِ فریقِ کثیفیت سے ادھر یا ادھر شریک تھے، وہ ایک دوسرے کو نعوذ باللہ فاسق یا کافر نہیں سمجھتے تھے، حضرت عمارؓ بن یاسر، حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کے سختِ طرفدار تھے، وہ حضرت عائشہؓ کی فوج کے مقابل میں اہلِ کوفہ کو شرکتِ جنگ کے لئے ابھارتے ہیں تو یہ الفاظ اُن کی زبان سے نکلتے ہیں اِنِّی لَا اَعْلَمُ اَنَّھَا لَزُجْمَةٍ فِی الدُّنْیَا مِیْن جَانِنَا ہُوں کہ وہ دنیا میں آپ کی بیوی تھیں وَ الْآخِرَةُ وَلَکِنَّ اللّٰہَ اَبْتَلاَکُمْ اور خیرت میں بھی آپ کی بیوی رہیں گی بین بنی میں لیکن خدا تم کو آزماتا ہے کہ اُکھا ساتھ دیتے لَتَتَّبِعُوْہُ اَوَاہَا۔ ہوا ان کا دیتے ہو۔

حضرت زبیرؓ کے قاتل نے جب حضرت زبیرؓ کا سر مبارک حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کیا تو آپؐ نے فرمایا ابنِ صفیہ کے قاتل کو جہنم کی بشارت ہو، ہم ہی وہ پیشِ حکمی شان میں خدا نے فرمایا ہے۔

وَنَزَّغْنَا فِیْ صُدُورِہُمْ اَنۡ (اہلِ جنت) کے سینوں کی سدا تو میں ہم مِیْنۡ عَلٰی اِخْوَانًا عَلٰی سُرُورِ نے دو کر دیں اور وہ جنت میں بھائی بھائی بن مَقَابِلَیْنِ، کراٹنے سامنے تخت پر بیٹھے ہوں گے۔

امیر معاویہؓ کو حضرت علیؓ سے جس قدر سیاسی اختلاف تھا وہ پوشیدہ نہیں لیکن جب علمی و دینی ضرورت پیش آئی تو ان کو اسی بارگاہ کی طرف

رجوع کرنا پڑا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل فوج لائی تھیں، لیکن دینی ضرورتوں کے موقع پر انہوں نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پایہ سے انکار نہیں کیا۔

بہر حال ان روایتوں سے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ ان بعض چند صحابہ میں جو اختلاف تھا، وہ فرقہ بندی کی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اختلاف رائے کی حیثیت رکھتا تھا، اس بنا پر سواد اعظم نے ان خلیفہ جنگیوں کو خطا، اجتہادی سے تعبیر کیا قرآن کی جو چند اوپر نیچے کی آیتیں علویہ اور عثمانیہ ہم کو سن کر رہ گئے تھے، وہ پوری آیتیں ہم کو سناتے ہیں۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ كُنْتَ إِحْدَهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُ الَّذِي تَبَغَّىٰ حَتَّىٰ تَفِيَّ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ كَانَتْ فَاصِلُهُمَا بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلَحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ

اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم لڑیں تو ایک دوسرے درمیان صلح کرو اور اگر اس میں سے ایک دوسرے پر ظلم کرے اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے تو ان میں صلح کرو۔ خدا اہل انصاف کو دوست رکھتا ہے۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرو، اور خدا سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

وہ صحابہ جو ان لڑائیوں میں شریک نہیں ہوئے اسلام کی تباہی

نہ سنن سعید بن منصور علیہ السلام، المسح علی الخفین۔

پران کے پردرد کلمات اور زمانہ فتن کے متعلق اس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور نصائح جس حسرت اور افسوس کے ساتھ بیان کرتے تھے، اب تک ان کے پڑھنے سے آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہیں فاتح ایران حضرت سعد وقاص رضی اللہ عنہ نے بھی ہو گئے تھے، اور کہتے تھے کہ اگر میرے گھر اگر بھی کوئی مجھ پر تلوار چلائے تو میں اپنا ہاتھ اس پر نہ اٹھاؤں گا۔

اہل بن ضیفؓ سے عدم شرکت کی وجہ پوچھی گئی تو کہا "میں نے جب اپنی تلوار میان سے نکال کر کندھے پر رکھی ہے تو دفعۃً تمام مشکلیں حل ہو گئی ہیں لیکن موجودہ مشکلات کی نسبت میں نہیں جانتا کہ کیا کروں"

حضرت علیؓ نے ایک بزرگ سے شرکت کی درخواست کی، انہوں نے عرض کی "میرے دوست اور آپ کے چچیرے بھائی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا ہے کہ جب ایسا وقت آئے تو لکڑی کی تلوار رکھنا، سودہ لکڑی کی تلوار لے کر چل سکتا ہوں" حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو بتایا کہ "یہ وہ زمانہ ہے جس میں سونے والا بیٹھنے والے سے اور بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے، کھڑا ہونے والا چلنے والے سے، اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہے"

چند ایسے صحابہ بھی تھے، جو اس زمانہ میں گھروں کو چھوڑ کر گاؤں

اور پہاڑوں میں چلے گئے تھے، ایسے بھی تھے جو اپنی رائے کے مطابق

ادھر یا ادھر فوج میں موجود تھے، لیکن انہوں نے تلوار نہیں چلائی، قاتل کے ابواب الفتن کو دیکھو تو اس قسم کے واقعات صفحہ صفحہ پر ملیں گے۔

اہل سنت کلام میں

در راہ عشق بیر ویشنیای نہ ایم ایس شیوہ را بطرز دگر می کنیم ما
گذشتہ اوراق میں ”اہل السنۃ والجماعۃ“ کی جو تعبیر کی گئی تھی وہ سیاہی
فروق کے مقابلہ میں تھی، لیکن حالات کے انقلاب سے یہی لفظ ایک اور
معنی پیدا کرتا ہے، جس کو ہم لفظ ”اہل السنۃ والجماعۃ“ کا دوسرا دور کہتے ہیں۔
اس دور کی تشنزع کیلئے ایک مختصر تمہید کی ضرورت ہے۔

عجم اور عرب کے خصائص ذہنی: جس طرح اشخاص کے
فطری خصائص اور اخلاق ہوتے ہیں، اسی طرح قوموں کی بھی فطری خصوصیتیں
اور ان کے طبعی اخلاق ہیں، عرب کی قوم فطرۃً ستر یا عمل ہے، ایران ستر یا
خیال اور تخیل ہے، جن لوگوں کی نظر علم کلام کی تاریخ پر ہے وہ جانتے ہیں
کہ جب تک عربوں کا اختلاط ایرانیوں کے ساتھ نہیں ہوا، عربوں کے ہر
قسم کے قوائے عمل زندہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو
دوسری قوموں کی تقلید و مشابہت سے منع فرمایا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ
مسلمانوں کے قولے اخلاقی، اسلامیت اور عربیت کے صحیح نمونہ پر قائم رہیں
حضرت عمرؓ نے مسلمان سپاہیوں کو ایران کی مہم پر روانہ کیا تھا تو ان کو نصیحت
کی تھی کہ ایرانیوں سے آرام طلبی کی تعلیم نہ حاصل کریں، غیر قوموں کو مسلمانوں

کے شبہ اور ان کے طرز لباس کی تقلید سے بھی اس لئے روکا کہ اسلامیت کا جوہر اس اختلاط اور تشابہ سے برباد نہ ہو جائے۔

کوفہ اور بصرہ کے شہر کیوں فتح ایران کے بعد عرب و عجم کے اختلافات کے مرکز بنے: حد درجہ فوجی چھاؤنیوں کی تعمیر کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ اسی ضرورت کی بنا پر کوفہ اور بصرہ کے شہر آباد ہوئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ شہر عرب و عجم کے مشترکہ اخلاق و نفس کے نمائش گاہ بن گئے، ان اطراف میں اسلام کے پہلے سے بھی پارسیوں کے وہ فرقے جن کا مذہب سرکاری مذہب کے موافق نہ تھا، اور سنیّت کے باطل فرقے شمار ہوتے تھے، آباد تھے، چونکہ یہ حکومت ایران کی آخری سرحد تھی، اس لئے اُن مذہبی مجرموں کے لئے اس سے بہتر کوئی مامن نہ تھا، عربوں نے فوجی نقطہ نگاہ سے ان مقامات کو اپنا فوجی مرکز قرار دیا۔

عرب کی خشک آب و ہوا میں رنگین طبیعتوں کی پرورش کے لئے عراق کے سبزہ زاروں اور دجلہ و فرات کے کناروں سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی، ان وجوہ سے اس زمانہ میں یہ شہر علم و مذہب اور ادب و تمدن کی دلچسپیوں کے باغ و بہار تھے، لیکن عرب و عجم کے رنگ و مذاق میں جو طبعی اختلاف ہے اس کے ابھرنے کیلئے بھی اس سے بہتر زمین کا کوئی قطعہ نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ و عمل کی فوجی سرزمین اداہام و خیال کی رزم گاہ بن گئی۔

مشاجرات صحابہ کے بعد لوگ کہتے ہیں کہ رات کو بیماری
اختلاف افکار کی شدت بڑھ جاتی ہے، لیکن واقعہ

یہ ہے کہ بیماری کی شدت نہیں بلکہ بیمار کے احساس کی شدت بڑھ جاتی
ہے دن کے شور و غل اور حواس کی مصروفیت میں احساس کا کم موقع ملتا
ہے، لیکن رات کے خاموش اور غیر مصروف گھنٹوں میں ہمارے احساسات
ایک ایک مونگے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہیں، اور اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔

امام حسنؓ اور امیر معاویہؓ نے جب باہم صلح کر لی، اور لوگوں کو
اطمینان سے غور کا موقع ملا تو ہر گروہ کو اپنے بدن کے زخم جن کے دیکھنے
کی پہلے فرصت نہ تھی محسوس ہونے لگے، دن کے شور و غل اور حواس
کی غافلانہ مصروفیت کے بعد اب شام ہو رہی تھی اور رات کے گھنٹے
آ رہے تھے، عمل کا دور ختم ہو کر اب تخیل کا دور شروع ہوتا ہے۔ سب
سے پہلے سوال یہ پیدا ہوا، اور یہ کوفہ میں پیدا ہوا کہ ہم اگر حق پر تھے تو
دوسرے فریق کی نسبت ہم کیا خیال کریں اور اگر حق پر نہ تھے تو ہم خود
مذہبی عدالت میں کیا ٹھہرنے میں؟ قرآن کہتا ہے۔

مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُتَعَدًّا فَعَرَأَتْهُ
جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا۔ جس نے کسی مسلمان کو عمدتاً قتل کیا اُس
کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

اہل السنۃ کا فیصلہ اس بنا پر عثمانیہ اور طرفداران معاویہ اپنے
کو برحق سمجھ کر دوسرے کو جہنمی قرار دیتے تھے، علویہ بھی اپنے مخالفین

کی نسبت یہی فیصلہ کرتے تھے۔ خوارج نے کہا کہ دونوں نے جان بوجھ کر ایک دوسرے پر تلوار چلائی اس لیے دونوں جہنمی ہیں۔ اہل السنۃ کا یہ فیصلہ تھا کہ یہ قتل عمد نہیں قتل خطا ہے۔ کہ ہر ایک فریق اپنے کو برسر حق جان کر اور دوسرے کو برسر باطل سمجھ کر مذہباً اور اعتقاداً دوسرے کا خون بہانا جائز اور مباح سمجھتا تھا۔ اس لیے اس کا فیصلہ اُس کے ہاتھ ہے، جو حقیقت حال سے واقف اور نیتوں کے اصل منشاء سے آگاہ ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں میں ہے کہ کوفہ سے چند لوگ حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں آئے، اور ان سے پوچھا کہ یہ آیت منسوخ ہے، فرمایا "نہیں یہ آیت آخری اُتری ہے، اس کو کسی نے منسوخ نہیں کیا، مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی فرمایا "قرآن میں تو یہ ہے کہ ہم مسلمانانِ اول کے لئے دعائے مغفرت کریں، لیکن لوگ اُن کو گالیاں دیتے ہیں" ام المومنین کا اس آیت پاک کی طرف اشارہ ہے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِأَخْوَانِنَا الَّذِينَ
خَلَاوْنَا هُمْ كَوَافِرًا وَارْحَمْهُمْ
سَبِّحُوْا بِأَلَا يُحْمَلُ
ایمان میں ہم سے پہلے میں معاف کر۔

یہ حدیث بخاری اور مسلم کی کتاب التفسیر میں ہیں، سلف صالحین

یہ فیصلہ ہمیشہ خانہ جنگیوں کے بعد ورنہ مناقب اور فضائل کے لحاظ سے حضرت علیؓ کا جو پایہ ہے وہ انہر من الشمس ہے۔

اور محمدین اہل سنت نے اصولی حیثیت سے اس مسئلہ کو ذکر کیا ہے، چنانچہ عقائد کی تمام کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے۔

خوارج کے نزدیک چونکہ یہ قتل عمد تھا جو گناہ کبیرہ ہے، اور جس سے دائمی جہنم کا انسان مستوجب ہوتا ہے اور دائمی جہنم کا مستوجب ہونا صرف کافروں کی صفت ہے اس لئے گناہ کبیرہ کا ترکب کافر ہے، اس نتیجہ نے خارجی مذہب کے اصول اولین کی حیثیت اختیار کر لی، اس کے بالمقابل ایک اور فرقہ ہوا جو **مُحَرِّصِیَّہ** کے نام سے مشہور ہوا، اس نے بعض احادیث کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا کہ ایمان کے ساتھ کوئی گناہ مضر نہیں، گناہ سے مومن کسی طرح عذاب کا مستحق نہیں ہوتا ہے، چم جائے کہ اس سے کفر لازم آئے۔ ایک تیسرا فرقہ **مُخْتَلِزِلَہ** کا ان دونوں کے بیچ میں پیدا ہوا، جس نے دونوں گزشتہ فریقوں کے دلائل حسن کر یہ فیصلہ کیا کہ گناہ کبیرہ کا ترکب نہ مومن ہے نہ کافر، وہ کفر اور ایمان کے بیچ کی منزل میں ہے۔

اہل السنۃ پھر آگے بڑھتے ہیں، وہ ان فرقوں کی طرح جو صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے، صرف ایک دو آیت یا حدیث کو لے کر فیصلہ نہیں کرتے، اُن کے سامنے قرآن کی تمام آیتیں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و ہدایات تھیں۔ صحابہ کے آثار اور روایات تھیں۔ انہوں نے کہا، گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کفر لازم نہیں آتا، لیکن

اس کا ترکیب عذاب کا مستحق ضرور ہو جانا ہے، گویہ ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنی قدرت اور رحمت سے گنہگار کی خطاؤں کو معاف کر دے، اور اسے عذاب سے بچالے صحیح مسلم میں ہے کہ بعض لوگ خوارج کے دلائل سن کر خارجی بن گئے، اتفاق سے اُن کا گزر مدینہ میں ہوا، وہاں حضرت جابرؓ سے ملاقات ہوئی، اُن سے پوچھا کہ گنہگار بخشے بھی جائیں گے انہوں نے قیامت کے تمام واقعات اور گنہگاروں کی شفاعت اور مغفرت کی حدیث بیان کی، یہ سن کر آپ کے سوا سب تائب ہو گئے۔

فروق کی ملکی تقسیم: ہم نے پہلے لکھا ہے کہ ان فرقوں نے قومی تقسیم کے علاوہ ملکی تقسیم بھی حاصل کرنی تھی، شام میں عثمانی و اموی وغیرہ حامیان بنو امیہ تھے، اور عراق میں علوی اور اہل عجم تھے، بنو امیہ نے میدانِ کربلا میں جگر گوشہٴ رسول کے ساتھ جو کچھ کیا، سرزمینِ عجم میں صدیقؓ کے نواسہ (ابن زبیرؓ) کو جس بیدردی کے ساتھ قتل کیا، امام زین العابدین کے دلنبردِ زید شہید کا سحر جس طرح اُتار دیا گیا، مدینہٴ الرسول میں انصارِ کرام کو جو رسولؐ کے دست و بازو تھے جس صفا کی سے نہ تیغ کیا، بصرہ کے محدثین اور علماء کا خون جس طرح بے دریغ بہایا، اس کو دیکھ دیکھ کر اور سن سن کر تمام مجمعِ اسلامی دم بخود تھا۔

بنو امیہ کے دور میں: تلوار کا جادو زبان کو گونگا کر سکتا تھا، لیکن دل کا مذہبی فرقوں کا ظہور کاٹا نہیں نکال سکتا تھا، اس کیلئے مذہبی منتر

کی ضرورت تھی، آخر وہ منتر بنو امیہ کو مل گیا۔ اور وہ مسئلہ جبر تھا، یعنی یہ کہ انسان مجبور محض ہے، جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے، اس لیے انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں، اس کی ذمہ داری خدا پر عائد ہے، ان وجوہ سے ان سفایکوں کے وہ مجرم نہیں بلکہ نعوذ باللہ خود خدا ذمہ دار ہے، عراق کے اہل فکر نے اہل شام کے اس جواب کا جواب "نظریۃ قد" سے دیا، یعنی یہ کہ انسان اپنے تمام اعمال کا آپ ذمہ دار ہے، تقدیر کوئی شے نہیں ہے۔ خدا نے اس کے افعال پر اس کو قدرت دے رکھی ہے انسان خود جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے، یہ آواز سب سے پہلے عراق سے اُٹھی، اور سنسویہ یا سوسن نام ایک عجمی نژاد کی زبان سے بلند ہوئی معبد جنہی نے اس کو اصول عقائد میں داخل کر دیا، کچھ لوگ بصرہ سے حضرت ابن عمرؓ کے پاس آئے اور عرض کی کہ "ہمارے ہاں کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں جو تقدیر کے منکر ہیں، اور کہتے ہیں کہ تمام کام پہلے سے مقدر ہو کر نہیں بلکہ از سر نو ہوتے ہیں" حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ "ان سے کہہ دو کہ ہم کو ان سے تعلق نہیں، اور ان کو ہم سے نہیں" معبد جنہی نے مسئلہ قدر کو بصرہ کے علمی حلقوں تک پہنچایا، اور پھر رفتہ رفتہ اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔

۱۔ مقررہ جلد ۲ صفحہ ۳۵۹، مصر ۱۹۵۷ء صحیح مسلم کتاب الایمان وترغی باب اہما، فی القدریہ

۲۔ کتاب الصفات بہقی وخلق افعال العباد غاری ص ۵۱، طبع دہلی ۱۹۵۷ء صحیح مسلم کتاب الایمان۔

معبد اور عطاء بن یسار حضرت حسن بصری کی خدمت میں آتے اور عرض کرتے کہ ”یہ لوگ (بنو امیہ) خلق خدا کا خون بہاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ خدا کے حکم سے کرتے ہیں،“ انہوں نے کہا ”خدا کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں“ آخر معبد نے بغاوت کی اور عبد الملک اموی کے حکم سے قتل ہوا، معبد کے بعد عمر ابن عبید، جعد بن درہم اور غیلان دمشقی وغیرہ نے اس آواز کو دہنہ نہ دیا، اور یہ سب یکے بعد دیگرے بنو امیہ کے ہاتھ سے قتل ہوئے، ان کے قتل نے اس فرقہ میں اور زیادہ جوش برپا کر دیا، اور ایک دوسرا اصول ان میں مسلّم ہوا، کہ سفاکوں اور ظالموں کو ٹوکنا، اور عدل و انصاف کی دعوت دینا فرض ہے، ابتداءً اس فرقہ کا نام قدیریہ پڑا، اور آخر بڑھتے بڑھتے یہی معتزلہ بن گیا۔

فرقوں کا انتشار اب وہ وقت آگیا کہ امویہ کا دور گزر کر عباسیہ کا ستارہ اقبال خراسان کی سرزمین سے طلوع ہوا، یونان و عجم کے فلسفہ نے زبانوں کی گرہیں کھول دیں جس کے منہ سے جو بات نکلی وہ ایک مذہب بن گئی، عراق، خراسان رے وغیرہ ایران کے بڑے بڑے شہر مذہب سازیوں اور فرقہ بندیوں کے مرکز بن گئے خراسان میں حمیم بن صفوان ترمذی پیدا ہوا جس نے تمام صفات الہیہ کا انکار کیا، اور خدا کو مجبور محض فرض کیا، معتزلہ نے خدا کو صفات سے اس قدر منزہ کیا

کہ وہ معدوم کے ہم معنی بن گیا۔ ابن کرام سستانی نے رے میں خدا کی تجسیم کا وہ اعتقاد ظاہر کیا کہ ایک خوبصورت اور نفعہ صورت انسان بنا کر تخت پر بٹھا دیا، معتقدین تجسیم بھی ایک خیال پر متفق نہ ہوئے **خراسان** میں سلیمان مفسر نے یہ اعتقاد ظاہر کیا کہ خدا کا جسم گوشت اور پوست سے مرکب ہے۔ بشام بن حکم نے گوشت پوست کے بجائے اس کو نورانی الجسم کہا، بشام بن سالم جو القی نے کہا خدا نور ہے، گوشت پوست نہیں، اوپر کا دھڑ مخوف اور نیچے کا دھڑ ٹھوس ہے، اس کے کالے کالے بال ہیں، انسانوں کی طرح حواس خمسہ رکھتا ہے، اُس کے ہاتھ ہے پاؤں ہے، منہ ہے، ناک ہے، ڈاڑھی نہیں، میاں بن سمناس نے کہا خدا کے جسم تو ہے، لیکن وہ قیامت میں فنا ہو جائے گا صرف چہرہ رہ جائے گا، معتزلہ نے خدا کی رویت کا انکار کیا، دوسرے نے کہا رویت ان حواس خمسہ سے نہیں بلکہ ایک اور حاسہ سے ہوگی، جو قیامت میں خدا پیدا کرے گا۔

یہ بحث تو صرف خدا کی ترکیب کے لحاظ سے تھی، خدا کے صفات کی بحث اس کے بعد شروع ہوتی ہے **جہمییہ** نے خدا کے صفات الہیہ سے انکار کیا کہ اگر صفات ہوں تو ان کی بقا بھی لازم آتی ہے، اور دائمی بقا صرف خدا کی ذات کو ہے۔ نیز اگر صفات الگ ہوں تو ذات و صفات سے بل کر خدا کی ترکیب لازم آتی ہے، اور وہ ترکیب سے

پاک ہے، معتزلہ نے کہا خدا کی عین بسیط ذات ہی صفات کی قائم مقام ہے، اس کے مقابل طواہر نے کہا صفات، ذات سے الگ مستقل ہستی رکھتی ہیں، اشاعرہ نے کہا کہ صفات نہ عین ذات ہیں نہ خارج از ذات ہیں کبھی بلخی نے کہا کہ خدا میں صرف ایک صفت علم ہے اور ارادہ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔

ایمان اور عمل ایک شے ہے، یا عمل ایمان سے خارج ہے، ایمان زبان سے صرف اقرار کا نام ہے، یا دل سے محض اعتقاد کا، یا زبان کے اقرار اور دل کے اعتقاد دونوں کے مجموعہ کا، ایمان میں کمی زیادتی ہو سکتی ہے یا نہیں، خدا پر ایمان لانا عطا واجب ہے یا سمعاً، نبوت کا ثبوت عقل سے ہوتا ہے یا نقل سے، معجزہ ممکن ہے، معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں، معجزہ مخفی اسباب پر مبنی ہوتا ہے یا محض خدا کے حکم سے ہوتا ہے، خدا کے احکام میں مصالح اور حکم ہوتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی مشیت محض سے وہ احکام صادر ہوتے ہیں، خدا کے کام اسباب کے زیر اثر ہیں یا نہیں، قرآن کس حیثیت سے معجزہ ہے؟ قرآن کا جواب درحقیقت نہیں ہو سکتا تھا، یا ہو سکتا تھا لیکن خدا نے انسان سے اس کی قدرت سلب کر لی ہے، قرآن میں وجہ اعجاز کیا ہے؟ اس میں پیشینگوئیوں کا ہونا یا اس کی عبارت کی فصاحت و بلاغت، قرآن کلام الہی کیونکر ہے، وہ قدیم ہے یا حادث،

اس کے الفاظ بھی قدیم ہیں یا صرف معانی، جنت اور دوزخ اس وقت موجود ہیں یا قیامت میں ان کا وجود ہوگا، دوزخ کو بھی بہشت کی طرح دوام ہوگا یا قیامت کے بعد اس پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب اس پر فناطاری ہو جائے گی، اور اسی طرح بہشت ہمیشہ قائم رہے گی، یا ایک زمانہ کے بعد اس پر فناطاری ہو جائے گی۔ قبر میں بندہ پر عذاب ہوتا ہے یا نہیں، دوزخ میں کفار سب ایک بار جلیں گے، یا بار بار، خدا کو محال پر قدرت ہے یا نہیں، وہ ظلم کر سکتا ہے یا نہیں؟

امامت کا سلسلہ ہم نے چھیڑا نہیں، کہ اس سے پھر ایک اور تسلسل پیدا ہوگا۔

یہ اور ان کے علاوہ سینکڑوں مسائل مختلف فرقوں کے عقائد کی صورت میں پیدا ہوئے، اور جس کی عقل نے جو بات کہی وہ ایک گروہ کا مذہب قرار پا گئی، چنانچہ یہ تمام مسائل مختلف فرقوں میں نفیاً یا اثباتاً اصول مذہب میں داخل ہیں، اور عقل و نقل کی کتابوں میں ان کی تفصیلات درج ہیں، یہ اختلافات صرف زبان اور دلائل تک محدود نہ رہے، بلکہ بارہا دست و گریبان تک نوبت پہنچی تبیسری صدی میں اشعرتیت پیدا ہوئی، جس نے محدثین اور فقہاء میں بھی حُسن قبول پیدا کیا، کہ اس کا مسلک عقل و نقل اور معتزلہ اور ظواہر کے

بیچ بیچ میں تھا، اس نے ایک طرف باقلائی ابن نورک، غزالی اور رازی کے زورِ بیان سے، اور دوسری طرف ملک شاہ سلجوقی سلطان محمود غزنوی، سلطان صلاح الدین ایوبی، اور محمد بن تومرت موحدی (اسپین) کی تلواروں سے وہ قوت حاصل کی کہ تمام فرقے اس کے سامنے دب گئے، تاہم بغداد کی سرزمین جب تک شاداب رہی، خائبہ اور اشاعرہ کے جن میں سے ہر ایک کتاب و سنت پر عمل ایمان کے دعویدار تھے، کبھی باہمی فتنوں سے خالی نہ رہی۔

ضلالت کے طبعی اسباب! اسلام کے مختلف فرقوں کی پوری روداد اب آپ کے سامنے ہے، غور سے پڑھیے، اور دیکھئے کہ ان اختلافات کا اصلی مبنی، اور اُن کی پیدائش کے اصلی اسباب کیا تھے؟ یہ تھے کہ اسلام کی عملی زندگی کو چھوڑ کر صرف تخیل کی زندگی اُن پر چھا گئی تھی۔

خیال آرائی! اسلام میں اختلافات کی جو بنیاد پڑی، جب تک ان میں جمعی عنصر غالب نہ ہوا وہ عمل اور زندگی کی جنگ تھی، وہ مذہب کی آمیزش کے بغیر خالص سیاسی اور پولیٹیکل جنگ رہی، جس کے فیصلے کئی بار تلوار سے چاہے گئے، عجمیت کے عنصر نے پالیٹکس کو مذہب کے پردے میں چھپا دیا، اور تلوار کی جگہ شکوک و شبہات، استدلالِ عام فریب، تناویلِ فاسد اور تغیرِ عقائد نے لے لی، نتیجہ یہ ہوا کہ تلوار کی جنگ

گو مادی اجسام کو فنا کر رہی تھی لیکن قومی زندگی کی رُوح کو نہیں فنا کر رہی تھی قوم میں زندہ رہنے کا جوش و خروش تھا، لیکن خیال آرائی کے اس طرزِ جنگ نے زندگی کے اصل جوہر مذہب کی اصل رُوح، اور عمل کی اصلی قوت کو فنا کر دیا۔

عقائد میں وسعت طلبی! اسلام کے اصل عقائد نہایت سادہ اور مختصر ہیں، کوئی انکو سمیٹنا چاہے تو صرف ایک لآلہ اللہ میں سمیٹ سکتا ہے۔ جیسا کہ اس حدیث میں ہے کہ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ، جس نے لآلہ اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوا، اور اگر کچھ پھیلائے تو وہ سارے قرآن کو محیط ہے، اسلام نے اصولِ دین کو چھ دفعات میں یک جا کر دیا ہے، اور وہ یہی ہے جو سورہ بقرہ کے اول و آخر میں ہے، اور ایک حدیث میں ان کو بیان کیا گیا، ایمان باللہ، ایمان بالرسول، ایمان بالکتاب، ایمان بالملائکہ، ایمان بالیوم الآخر، ایمان بالنہایت یہ دفعات صحابہ کے عہد میں بالکل سادہ تھے مگر جیسے جیسے مسلمانوں میں خیال آرائی بڑھتی گئی ان مسائل میں نئے نئے مباحث بڑھتے گئے۔

اسلام عقائد کی وسعت اور کثرت کا شائق نہیں، بلکہ اسکے رسوخ، استوری اور شدتِ اذعان کا طالب ہے، لیکن انسانیت کی بیمار فطرت ہمیشہ وسعت کی طرف جاتی ہے، خلاقِ فطرت کا فرستادہ اس رمز سے آگاہ تھا صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا

لَنْ يَجْرَحَ النَّاسُ يَسَاءَ لَوْ نَحْنُ حَتَّىٰ لَوْ كُنَّا بِمِثْلِ مَا كُنَّا فِيهِ لَمْ نَكُنْ بِمِثْلِ مَا كُنَّا فِيهِ

لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے بحث و مناظرہ کرتے رہیں گے یہاں تک پہنچے کہ اچھا خدائے سب

فَمَنْ خَلَقَ اللَّهُ؟

جینوں کو پیدا کیا، پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟

تساویل متشابہات | مسلم میں حضرت عائشہ رضی

مروی ہے کہ آپ نے آیت ذیل تلاوت فرمائی۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ
مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ
الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا
الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ
مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَ
ابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ
إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ
يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا
وَمَا يَذْكُرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ،

اس غلط ترجمہ پر یہ کتاب نازل
کی، جس میں کچھ آیتیں محکم اور
واضح ہیں، وہ اصل کتاب ہے
اور بعض متشابہ ہیں جن کے
دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ کے
پیچھے پڑتے ہیں، فتنہ اٹھانے
اور اس کے مطلب کو حل کرنے
کیلئے حالانکہ اس کا حقیقی مطلب
خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا،
اور جو لوگ علم میں پکے ہیں وہ کہتے
ہیں ہم اس پر ایمان لائے یہ
سب خدا کی طرف سے ہوا اور
مخلفہ مندوں کے سوا کوئی عبرت
نہیں پکڑتا۔

پھر فرمایا:

إِذَا رَأَيْتُمُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ
مَا تَشَابَهَ مِنْهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ

جب ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہ
کے پیچھے پڑتے ہیں تو جانو کہ یہ

سَمَى اللّٰهُ فَاحْذَرُوْهُمْ، وہی ہیں جنکا خدا نے نام لیا ہے

توان سے احتراز کرو۔

اسی بناء پر صحابہ کرام سے اگر کبھی کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا جو اس ارشاد کے خلاف ہوتا تو آپ سخت برہم ہوتے، ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے اور ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ کچھ اصحاب ایک حلقہ مجلس میں بیٹھے بحث و نزاع میں مشغول ہیں، فرمایا کہ کس مسئلہ میں گفتگو کر رہے ہو؟ عرض کی مسئلہ تقدیر میں، یہ سنتے ہی آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا، راوی کا بیان ہے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی نے چہرہ مبارک پر نار کے دانے نچوڑ دیئے ہیں، آپ نے فرمایا کیا تم کو اسی کا حکم دیا گیا ہے، کیا تم اسی لئے پیدا کئے گئے ہو، کیا میں ہی پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں؟ قرآن کی ایک آیت کو دوسری پر چلتے ہو۔ تم سے پہلے جو قومیں تھیں وہ اسی میں ہلاک ہوئیں، میں بتاؤ کہتا ہوں کہ اس میں جھگڑا نہ کرو۔

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام غفائد کی وسعت اور ان میں بحث و نزاع کا شائق نہیں، وہ صرف اس پیغام پر ایمان و یقین کا طالب ہے جو علی الاعلان وہ تمام دنیا کو سنا رہے جس کے سمجھنے میں نہ عرب کے بدوؤں اور افریقہ کے حبشیوں کو

تامل ہے اور نہ یونان کے حکیموں اور یورپ کے فلاسفروں کو،
 بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صاحب کو ایک مسلمان غلام
 آزاد کرنا تھا، وہ احمق سی کوئی حبشیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
 خدمت میں لائے اور دریافت کیا کہ کیا یہ مسلمان ہے؟ آپ نے اس
 سے پوچھا کہ خدا کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی،
 آپ نے ان صاحب سے فرمایا، لیجاؤ یہ مسلمان ہے،

اللہ اکبر، اسلام کی حقیقت پر کتنے پردے پڑ گئے ہیں، آپ
 اسلام کے لئے صرف آسمان کی طرف انگلی اٹھا دینا کافی سمجھتے ہیں لیکن
 ہمارے نزدیک آج کوئی مسلمان، مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک نسفی
 کے تمام بندھے ہوئے عقائد پر حرفاً حرفاً اُمنت نہ کہتا جائے۔

جنگِ عقاد و دُؤ ملت ہم را عذر نہ

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدن

پہلی دو نشستوں میں ہم یہ اچھی طرح واضح کر چکے ہیں کہ مذہب
 کی اصلی اور حقیقی تصویر وہی ہے جو داعیِ مذہب کے علم و عمل اور
 اس کی تعلیم و تلقین کا صحیح اور بُہو ہو عکس ہو، پیغمبر کی ضرورت ہم نے
 اسی لئے تسلیم کی ہے کہ عقلِ انسانی زندگی کی اصلی گمراہوں کے کھولنے
 سے عاجز ہے۔ اس لئے رحمتِ الہی انسانیت کے ایک بلند ترین پیکر
 کو روح القدس کے توسط سے انسانوں کی رہنمائی کے لئے بھیجتی ہے۔

وہ لوگوں کو ہر قسم کے تلقینات سے مشرف کرتا ہے۔ اُن کو اُن کی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے تعلیمات دیتا ہے، لیکن ما فوق الفہم اسرار کے سمجھنے کی حیات انسانی کو حاجت نہیں، اور اس کی علمی زندگی کے لئے اُن کا علم ضروری نہیں، ان کو وہ اسی طرح سر بستہ چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے اور ان کے متعلق وہ صرف یہ سکھا جاتا ہے،

وَمَا يَنْفَعُكُمْ تَاوِيلُهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ
فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ
عِنْدِ رَبِّنَا،
اسکی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں
جانتا، اور جو علم میں راسخ اور پختہ
میں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان
لائے یہ سب ہمارے پروردگار
کی طرف سے ہے۔

اس بناء پر اگر ہم ان اعتقادات اور تعلیمات پر جو یہ پیغمبر نے انسانوں کے لئے ضروری سمجھے، اپنی عقل اور سمجھ سے کچھ اضافہ کرنا چاہتے ہیں، یا کچھ اس میں سے حذف کرنا یا بڑھانا چاہتے ہیں، یا جس گروہ کو جہاں تک اس نے کھول کر چھوڑ دیا ہے ہم اس کو اور کھولنا چاہتے ہیں، تو درحقیقت ہم اصل نبوت کے ثبوت کے دعویٰ کو کمزور کر رہے ہیں اور عملاً ہم بتانا چاہتے ہیں کہ انسانیت کی تکمیل کے لئے پیغمبر کی حاجت نہیں بلکہ خود عقل انسانی ہماری رہبری کے لئے کافی ہے، حالانکہ اس کا بطلان ہمارے نزدیک بدیہی الثبوت ہو چکا ہے۔

غور کیجئے کہ مذہب کیا چیز ہے؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟
 انسان کی عملی زندگی کے لئے وہ چراغِ راہ ہے، انسان اور اس کی
 عملی زندگی کا تعلق تمام تر مادیات سے ہے، اس لئے ماورائے
 مادہ کی نسبت صرف وہیں تک اس کو تعلق ہے جہاں تک انسان
 کی عملی زندگی کے لئے ضروری ہے، ہم اپنے مقصود کو اور زیادہ واضح
 کرنے کے لئے ذرا تفصیل سے کام لیتے ہیں۔

مذہب میں دو چیزیں ہوتی ہیں، عقائد اور اعمال، دوسرے
 الفاظ میں ان کی تعبیر ہو سکتی ہے کہ مذہب علم اور عمل سے مرکب ہے۔
 علم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو مادیات سے ماخوذ اور
 انھیں سے وابستہ ہے اور اس کے متعلق ہم میں بذریعہ مشاہدہ اور
 تجربہ کے یقین پیدا ہوتا ہے، دوسرا وہ علم ہے جس کا تعلق ماورائے
 مادہ سے ہے اور جس کے جاننے کا ذریعہ صرف تخیل، تصور اور
 ظن ہے، ”آگ جلاتی ہے“ یہ علم مادی ذریعہٴ احساس سے ہم کو حاصل
 ہوا ہے، اس لئے ہم کو اس درجہ یقین ہے کہ غلطی سے بھی ہم آگ
 میں کودنے کی ہمت نہیں کر سکتے، لیکن دوسرا علم یہ ہے کہ انسان
 مرنے کے بعد کچھ دوسرا جہنم لیتا ہے، لیکن اس علم پر اعتماد کر کے
 کیا کوئی انسان اپنی زندگی کا آپ خاتمہ کر دینے پر تیار ہو گا؟
 ہماری زندگی اسی عالمِ مادی سے تعلق رکھتی ہے، ہمارے اعمال

اسی عالم میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، افراد انسانی کی کامیابی اور ناکامی قومیں اور قوموں کی ترقی و تہذیب، عروج و زوال، انقلاب و تغیر غرض انسانیت کے جملہ مظاہر اور عالم کے تمام تر نظام ترقی انہیں یقینیات اور علوم قطعیہ پر مبنی ہیں، جن کا ماخذ ہمارے حواس ہیں، اس بناء پر ان علوم و مسائل اور معلومات کے پیچھے پڑنا اور ان کی گہرے کشائی چاہنا، جو ماورائے حواس ہیں، اور جن کے ساتھ ہمارا علم متعلق نہیں ہو سکتا، ہمارے لئے بالکل بے سود اور غیر مفید ہے۔

ہمارا فلسفہ جس کا تعلق ماورائے مادہ سے ہے "علم ظنی" ہے سائنس کا اکثر حصہ ہمارے گزشتہ تجربوں اور مشاہدوں کی بناء پر ایک حد تک درجہ یقینی رکھتا ہے، اب دیکھ لیجئے کہ دنیا ان دونوں میں سے کس کی ممنون ہے؟ فلسفہ کی یا سائنس کی؟

یونان کے سب سے پہلے فلسفی تالیس سے لے کر سقراط کے عہد تک ڈھائی ہزار برس میں فلسفہ دنیا کے لئے کیا کارآمد ہوا، لیکن سائنس نے دو تین سو برس کے اندر اندر عالم میں ایک انقلاب پیدا کر دیا، اس بناء پر غیر مادی اور غیر محسوس اشیاء کی نسبت یہ سوال کہ وہ کیا ہیں؟ اور کیونکر ہیں؟ بالکل بے سود ہے، اور اس کی دلیل، اس سوال کے حل میں انسانی نسلوں کی گزشتہ صدیوں اور قرون کی ناکامی ہے، اس لئے ہماری بحث اور تحقیقات

کا موضوع نفیاً اثباتاً غیر محسوس اشیاء نہیں ہو سکتیں،

یہی وہ نکتہ ہے جس کو یورپ نے اب سمجھا ہے، اور جس کو اسلام نے اپنے آغازِ ظہور میں ہی واشگاف کر دیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اہل سنت کے سوا اسلام کے اور فرقوں نے اس کو محفوظ نہیں رکھا، اور یہی آخر ان کی بے راہ روی کا سبب ہوا، اور اس کا بڑا نقصان یہ پہنچا کہ ہماری خیالی دنیا وسیع ہو گئی مگر عملی دنیا تنگ ہو گئی، منطق و فلسفہ کی خیالی و قیاسی بحثوں کی بھول بھلیوں میں پھنس کر تجربی مادی علوم سے جن کا مدار اشیاء کے خواص و صفات کی معرفت پر ہے ہم بے خبر ہو گئے، اور دشمن ہم سے بازی لے گیا اور عملی و مادی دنیا کی ہر چیز میں ان کے محتاج ہو گئے، یہ عملی نقصان تو عملی اقتصادی حیثیت سے پہنچا، اور دین کی حیثیت سے یہ نقصان پہنچا کہ عقائد کی ان عقلی پیچیدگیوں میں الجھ کر اخلاق و عمل میں ہم سست و ناکارہ رہ گئے اور دین و دنیا ہر حیثیت سے ہمارے عملی قویٰ کمزور اور سست ہوتے چلے گئے۔ اس تفصیل سے یہ ظاہر ہو گا کہ اہل سنت کے مذہب کا مدار اور مبنی یہ دو اصول ہیں،

(۱) داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عقائد اور اعمال کے متعلق اپنی اُمت کو جو کچھ تعلیم اور تلقین کی، اس پر استوار رہا جائے یہی صراطِ مستقیم ہے۔

(۲) عقائد یا خدا کی ذات اور صفات کے متعلق قرآن نے جو کچھ بیان کیا یا آپ نے جو کچھ بتایا، اور جس مسئلہ کی حد تک قرآن نے تشریح کی، صرف اسی پر ایمان لانا واجب ہے، صرف اپنی عقل و قیاس و استنباط سے، نصوص کی روشنی کے بغیر اس کی تشریح و تفسیر صحیح نہیں، اور نہ اس پر ایمان لانا اسلام کی صحت کے لئے ضروری ہے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ گمراہی اور ضلالت کا موجب ہو،

اسلام کے تمام فرقے اگر ان دو اصولوں پر قائم رہتے تو یقیناً عقائد کے وہ عظیم الشان اختلافات رونما نہ ہوتے، جس کے سیلاب نے ایک مدتِ مدید سے کاشائے اسلام کے ارکان متزلزل کر رکھے ہیں، خوب غور کیجئے، گذشتہ مباحث میں ہم نے مختلف فرقوں کے جو مسائل اور معتقدات گنائے ہیں ان کی گمراہی کا سبب صرف یہی ہے کہ انہوں نے ان امور کی تفصیل چاہی جن سے قرآن خاموش تھا اور جن کی تشریح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروری نہیں سمجھی، کہ اول تو وہ اُن سر بستہ اسرار اور مشکل عقیدوں میں سے ہیں جن کا حل عقل انسانی کے فہم و ادراک سے باہر ہے اور ثانیاً یہ کہ انسان کی عملی زندگی کے لئے ان کا علم بے سود ہے۔

شریعت نے خدا کے متعلق یہ بتایا ہے کہ وہ ایک ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہ تمام اعلیٰ صفتوں سے متصف ہے، اور

برعیب سے پاک ہے، اس کے بعد یہ بحث کہ وہ ایک کس حیثیت سے ہے، صفات کی مختلف قسمیں ہیں کون سی صفتیں اس میں پائی جاتی ہیں؟ یہ صفات اس کی ذات میں داخل ہیں یا اس کی ذات سے الگ ہیں اگر الگ ہیں تو قدیم ہیں یا حادث، اگر قدیم ہیں تو تعددِ قدماء لازم آتا ہے حالانکہ قدیم صرف ایک ہی ہے، اگر حادث ہو تو خدا محل حادث ہوگا اور محل حادث خود حادث ہوتا ہے، اگر الگ نہیں بلکہ ذات میں داخل ہیں تو ذات کا جز ہو کر یا کل ہو کر، اگر ذات کا جز ہے تو خدا کی ترکیب لازم آتی ہے اور اگر کل ہے تو عین ذات ہوگی، اس لحاظ سے اس کی ذات اور صفات میں سے ایک کی نفی لازم آئے گی اور علم، قدرت، سمیع، نصیر، ارادہ وغیرہ مختلف صفات مختلف نہیں بلکہ متحد ہو جائیں گی۔

خدا کی نسبت ہاتھ پاؤں، منہ اور قدم کے الفاظ کتاب و سنت میں آئے ہیں۔ ان سے حقیقی معنی مراد ہیں یا مجازی، خدا کی نسبت قرآن میں ہے کہ ”وہ عرش پر مستوی ہوا“۔ اور یہ بھی ہے کہ ”جدھر رخ کرو اُدھر ہی خدا کا منہ ہے“۔ یہ بھی ہے کہ ”وہ تمہاری رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے“ تو آیا وہ کسی خاص جگہ میں ہے، یا جگہ سے مُبرا ہے

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ”وہ عرش پر جابرجا“ اَيُّنَا تَوَلَّوْا فَتَمَّ وَجْهَ اللَّهِ سَلَّمَ نَحْنُ اقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ

پہلی صورت میں اس کا جسم ہونا لازم آتا ہے، اور دوسری صورت میں کسی خارجی موجود کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ہر جگہ موجود ہے، سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔

احادیث صحیحہ میں ہے کہ قیامت میں خدا بہشت میں بہشتیوں کو نظر آئے گا اب اس پر یہ بحث کہ اگر یہ تسلیم کر لیں گے تو لازم آئے گا کہ وہ جسم ہو، کسی خاص جگہ میں ہو، اور اگر نظر آنا تسلیم کریں تو انہیں آنکھوں سے وہ رویت ہوگی، یا کسی اور جدید حاسہ سے، ان آنکھوں سے نظر آنا، خدا کے لئے جسم، رنگ، تحدید، تبیین وغیرہ کو مستلزم اور آخری صورت میں موجودہ ذرائع احساس کے علاوہ کسی اور ذریعہ احساس کا اعتقاد فہم سے بالاتر ہے۔

شریعت میں اس قدر ہے کہ خدا نے عالم کو پیدا کیا اور وہ اس کا مخلوق ہے، اس کے بعد یہ مباحث کہ خداوند تعالیٰ اس کی علتِ کامل ہے یا ناقص، اگر علت ناقص یعنی غیر تامہ ہے تو عالم کی خالقیت کے لئے کسی اور شے کی شرکت بھی لازم آتی ہے اور اگر علتِ کامل یعنی تامہ ہے تو علتِ تامہ اور معلول کا وجود ساتھ ساتھ ہوتا ہے اس بناء پر عالم کو بھی قدیم ہونا چاہیئے،

قرآن نے بتایا ہے کہ بندوں کے تمام افعال خدا کے حکم سے ہوتے ہیں، اس کے بعد یہ سوالات کہ اس کا حکم ہی فعل کے وجود کا سبب

ہونا ہے یا بندہ کے عمل کو بھی دخل ہوتا ہے، اگر دخل نہیں تو بندہ کو
مجبور محض کہنا ہوگا، اگر دخل ہے تو یہ دخل موثر ہے یا غیر موثر، اگر موثر
ہے تو درحقیقت وہ اپنے فعل کا آپ خالق ہوا، اور اگر غیر موثر ہے
تو دوسرے معنی میں جبر ہے،

یہ تمام مذکورہ بالا مسائل اور ان کی جو تحقیقیں کی گئی ہیں وہ
نفیاً یا اثباتاً کسی نہ کسی فرقہ کا معتقد علیہ اور مسلک ہیں۔ لیکن آپ
نے دیکھا کہ عقلی توہم پرستی کے اعتراضات سے ان میں سے کوئی
شق بھی بری نہیں، یہ اعتراضات یا لوازم مستحیلہ، یا عقلی سرگردانیاں
کیوں پیدا ہوئیں، اس لئے کہ ہم قرآن کی تلقینات پر قناعت نہیں
کرتے، اور ان امور کی تشریح چاہتے ہیں، جن کی تشریح سے عقل
انسانی عاجز ہے، اور ہماری عملی زندگی کے لئے وہ غیر ضروری ہیں۔

اگر ہم اپنے معتقدات کے احاطہ کو اس دائرہ کے اندر کر لیں
جس کو وحی الہی کے پرکار نے سطح اسلام پر کھینچا ہے، تو یہ حصار
ہمارے لئے یقیناً قلعہ روئیں کا کام دے گا، اور ہم ان بہت سے
خدشوں اور حملوں سے محفوظ ہو جائیں گے، جو قرآن کی تصریحات
کے سبب نہیں، بلکہ خود ہمارے عقلی تفصیلات کے باعث ہم پر
عائد ہوتے ہیں، اور غلطی سے ہم ان کا مستوجب اپنے مذہب کو
قرار دیتے ہیں، بہت سے فرق اسلامیہ سے بڑی مسامحت یہ ہوئی

کہ عقل اور فلسفہ نے جس امر کے متعلق بھی کوئی جواب چاہا انھوں نے اپنے ناخنِ تدبیر سے اس کو حل کیا، اور نفیاً یا اثباتاً اس کو داخلِ مذہب کر لیا، یہاں تک کہ خالص فلسفیانہ مسائل جن کو مذہب سے ایک ذرہ تعلق نہیں، مثلاً جُزْءُ الذِّیْ لَا یَتَجَزَّیٰ کی بحث، طُفْرَہ کا مسئلہ، رویت کے اسباب، استطاعت مع الفعل کی بحث وغیرہ اس کو بھی انھوں نے عقائد کی کتابوں میں داخل کر لیا ہے اگر آج ہمارے عقائد کی کتابوں کی چھان بین کی جائے تو نصف سے زیادہ اوراق انھیں مباحث سے بھرے ملیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ متکلمین نے عقائدِ صحیحہ پر جو شکوک و شبہات مدعیانِ عقل کی طرف سے عائد ہوئے ان کے جواب کی خاطر ان مسائل میں بحث کی، اور بعض پہلوؤں کی تصریح پر وہ مجبور ہوئے اور اس طرح علمِ کلام کا یہ سارا دفتر وجود میں آیا، اور اس لئے بھی یہ بحثیں کیں کہ فرقِ ضالہ کے آراءِ باطلہ سے مسلمانوں کو بچائیں، اور یہ کوششیں ان کی مشکور ہوئیں، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے سیدھے سادے عقائد میں الجھنیں بھی پیدا ہو گئیں۔

الغرض اہل السنۃ نے جو صراطِ مستقیم اختیار کیا وہی حقیقت اس طوفانِ افکار اور طغیانِ خیالات کی حالت میں سفینۂ نوح ہو سکتا تھا، لیکن دو تین سو برس کے بعد تیسری چوتھی صدی میں

جب مسلمانوں میں فلسفہ نے عروج حاصل کر لیا، اور ممالک اسلامیہ کے در و دیوار سے اس آواز کی بازگشت آنے لگی، تو خود اہل السنۃ میں سے چند افراد اٹھے، اور قدیم شاہراہ کو چھوڑ کر انھوں نے اہل السنۃ اور دیگر فرقوں کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کیا، اور عقل و نقل اور فلسفہ و سنت کے درمیان ایک متذبذب صورت کو اپنا مسلک قرار دیا، انھوں نے یہ سمجھا کہ اس طریقہ سے وہ عقل و نقل اور فلسفہ و شریعت کی تطبیق میں نہ تو معتزلہ کی طرح قرآن و سنت سے دور پڑ جائیں گے، اور نہ ارباب ظواہر کی طرح اہل فلسفہ کے نشانہ اعتراضات بنیں گے، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے یہ مسائل نہ تو اصل قرآن و سنت کے مطابق رہے اور نہ عقل و فلسفہ کے دربار ہی میں وہ رسوخ پاسکے۔

مثلاً ایک طرف تو انھوں نے معتزلہ کے ساتھ ہو کر خدا کے لئے اعضاء کے اطلاق سے انکار کیا، اور ان آیتوں میں جن میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور منہ کا ذکر ہے تاویل کی، اور دوسری طرف ظاہر یہ کہ ساتھ خدا کی رویت کا اقرار کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اہل السنۃ کا ساتھ دے سکے، اور نہ اہل فلسفہ کی معیت برقرار رہ سکی، ان کو بدیہیات کا انکار کرنا پڑا کہ رویت کے لئے مرنے کا جسم ہونا، نتیجہ ہونا ذی لون ہونا، آنکھ کے سامنے ہونا، اس سے ایک مسافت پر ہونا،

ضروری نہیں، ایک اور مسئلہ میں یعنی مسئلہ جبر و قدر میں انھوں نے اسی قسم کا توسط اختیار کیا، ایک طرف تو یہ کہا کہ تمام افعال کا خالق خدا ہے، یہ کہہ کر گویا اپنے کو معتزلہ اور قدریہ سے الگ کیا، دوسری طرف انسان کے لئے کسب ثابت کیا کہ جبر نہ لازم آئے، لیکن جب یہ سوال کیا گیا کہ کیا یہ کسب فعل کے وجود میں موثر بھی ہے؟ تو جواب نفی میں دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جبر یہ سے قریب ہو گئے جیسا کہ ہر صاحب نظر کو تفسیر کبیر میں امام رازی کا انداز نظر آتا ہے۔

جس طرح اسلام میں بہت سے ایسے فرقے ہیں جو درحقیقت دائرہ اسلام میں داخل نہیں، اسی طرح بہت سے ایسے فرقے بھی ہیں جو خود کو اہل السنۃ کہتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ ان میں سے نہیں ہیں، سبب یہ ہے کہ قدمائے اہل السنۃ نے جو اصول قرار دیئے تھے، دیگر عقل پرستوں کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر متاخرین نے ان میں تبدیلی کر دی، اور با اس ہمہ وہ اپنے کو اہل السنۃ سمجھتے ہیں، بلکہ لفظ اہل السنۃ کا صحیح مخاطب صرف اپنے کو ہی جانتے ہیں۔

تیسری چوتھی صدی سے اہل السنۃ میں عظیم الشان شاخوں میں منقسم ہیں۔

اشاعرہ، حنابلہ اور ماتریدیہ: اشاعرہ امام ابو الحسن اشعری کی طرف منسوب ہیں، اور امام شافعیؒ کے عقائد کے شارح

سمجھے جاتے ہیں، اس لئے تمام شوافع اشعری ہیں، خائبہ اپنے کو احمد بن حنبل کا پیرو کہتے ہیں، ماتریدیہ امام ابو منصور ماتریدی کے پیرو ہیں، جو بچند واسطہ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد تھے، اس لئے اخاف نے عقائد میں ان کو اپنا امام مانا، بہر حال ان بزرگوں کے باب میں جو اقوال ملتے ہیں وہ قدمائے اہل السنۃ اور سلف صالح کے مطابق ہیں، لیکن متاخرین اہل السنۃ سے بڑی مسامحت یہ ہوئی کہ اُن مسائل کے متعلق جن سے شریعت خاموش تھی، اُن کو حوالہ علم الہی کرنے کے بجائے ان کی نسبت دیگر فرقوں کی طرح ادعائی پہلو اختیار کیا، اور بہت سے فلسفیانہ مسائل کو جن کو شریعت سے اصلاً تعلق نہ تھا ان کو داخل عقائد کر دیا۔

ان تصریحات سے واضح ہو گا کہ تاریکین سنت اور متاخرین اہل سنت جنہوں نے معتزلہ اور دیگر عقل پرست فرقوں سے مرعوب ہو کر قدمائے اہل سنت کے اصول میں ترمیم کی، اور اپنے مذہب کو قواعد عقلی کے مطابق بنانے کی کوشش کی، نتیجہ کی رُو سے ان دونوں میں بہت ہی کم فرق ہے، اور درحقیقت ان متاخرین کے اقوال کو سلف صالح اور اہل سنت کے عقائد اور خیالات سے کوئی واسطہ نہیں ہے، اور اگر ہے تو صرف اسی قدر جس قدر وہ کتاب و سنت سے قریب ہیں۔

جب ایک مسئلہ کے متعلق شریعت نے کچھ نہیں بتایا اور نہ اس کا جاننا اور اس کی اپنی عقل سے تفصیل کرنا مدار ایمان ٹھہرایا، اور نہ کسی حیثیت سے داعی اسلام نے اپنے مومنین سے اس پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا، اس کے متعلق آپ کا نفیاً یا اثباتاً کوئی بھی پہلو اختیار کرنا اور اس کو اسلام کا مبنی قرار دینا کیا حقیقت رسی ہے؟ کیا اس بارہ میں آپ کا فعل دوسرے فرقوں کے فعل کے مقابلہ میں کچھ زیادہ مستحسن ہوگا؟ اگر ان گروہوں کے کھولنے کے لئے آپ کی عقل رہبر بن سکتی ہے تو آپ آگے بھی بڑھ سکتے ہیں۔ اور نعوذ باللہ پیغمبروں کی آمد و بعثت سے بھی اپنے کو مستثنیٰ بنا سکتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر تقریباً ایک لاکھ نفوس قدسیہ نے ایمان و اسلام کی بیعت کی، لیکن کیا آپ کو وہ دفعات نامعلوم ہیں جن پر ان کے ایمان اور اسلام کی بنا تھی، کیا آپ کے پیدا کردہ غفائد کلامی میں سے ایک بھی ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اگر نہیں تو اپنے خود ساختہ اصول کی حیثیت سے نعوذ باللہ آپ ان کو کیا کہیں گے، ان کا ایمان صرف یہ تھا جس کو سورہ بقرہ کے اول و آخر میں بیان کیا گیا ہے،

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
 پیغمبر جو کچھ اُس پر اس کے خدا کی طرف سے اُتر اُس پر ایمان لایا

وَمَلَكْتِهِمْ وَكُتِبَ عَلَيْهِمُ لَا تُفَرِّقُونَ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ (بقرہ ۱۳۶)
 اوتنما مومنین، ہر ایک خدا پر
 یوں مسنون ہوا اُنزل ایلک و ما
 اُنزل من قبلك و بالاحزۃ ہم
 یوقنون، (بقرہ اول)

(متقی لوگ) جو کچھ تجھ پر اترا اور
 تیرے پہلوں پر اترا۔ ایمان لاتے
 ہیں اور آخرت پر بھی ایمان
 رکھتے ہیں۔

اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں خدا نے بتایا ہے
 کہ کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے، جب کوئی شخص قرآن پر
 ایمان لایا تو اس کے اندر جو کچھ ہے اجمالاً یا تفصیلاً ان سب پر
 ایمان لایا، خدا کے جو صفات اس میں مذکور ہیں۔ کتب الہی، ملائکہ
 اور پیغمبروں کے متعلق اُس میں جو کچھ ہے، قیامت، حشر و نشر،
 دوزخ و بہشت کی نسبت جو حالات اس میں مذکور ہیں یہ تمام
 چیزیں اس کے اندر داخل ہو گئیں۔ چنانچہ قدمائے اہل سنت اور
 سلف صالح کا اعتقاد یہ تھا کہ اُن میں سے ہر چیز پر ایمان اسی
 حیثیت سے اور اسی حد تک لانا ضروری ہے جہاں تک قرآن مجید

نے اس کا مطالبہ کیا ہے۔ یا جہاں تک سنتِ صحیح اور متواتر نے ثابت کر دیا ہے، کیونکہ یہ متفق طور سے ثابت ہے کہ عقائد کا ثبوت صرف قرآن مجید سے ہو سکتا ہے، اور احادیث میں سے صرف ان حدیثوں سے جو بذریعہ تواتر مروی ہیں، (مثلاً شبِ آخر گشتہ و افساء از افسانہ می خیزد)

قدماء کے نزدیک اہل سنت کے معنی

کل کی نشست میں ہم نے بتایا تھا کہ قدمائے اہل سنت کے یہ دو اصول تھے،

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عقائد و اعمال کے متعلق اپنی اُمت کو جو کچھ تعلیم و تلقین فرما گئے اس پر ایک ذرہ کا اضافہ یا اس سے ایک ذرہ کمی نہیں ہو سکتی۔

(۲) خدا کی ذات و صفات و دیگر عقائد کے متعلق قرآن نے جو بیان کیا ہے یا پیغمبر سے بتواتر جو کچھ ثابت ہے، اور ان کی نسبت اجمالاً یا تفصیلاً جو کچھ اور جس حد تک انھوں نے تفسیر و تشریح کی ہے اُسی پر ایمان لانا واجب ہے، اپنی عقل و قیاس اور استنباط سے ان کی تفسیر و تشریح کرنی صحیح نہیں، اور نہ اس پر ایمان لانا ہمارے ایمان کا جزو ہو سکتا ہے۔

یہ دو اصول ایسے ہیں جن کے اثبات کے لئے کسی مزید دلیل کی حاجت نہیں کیونکہ جیسا ہم اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ اکثر ایسے

مسائل میں جن کی نسبت عقل کا نفی یا اثبات ہر قسم کا فیصلہ ناقابل لحاظ ہے کہ یہ حدود اس کی دسترس سے باہر ہیں، اور اسی لئے ہم کو ایک پیغمبر کی ضرورت ہے، جو ہمارے علم کی دسترس سے باہر کی چیزوں کو ہمارے حق میں جہاں تک مفید و نافع ہو تعلیم دے، اور جب یہ مقدمہ صحیح ہے تو ان مسائل کی خالص عقل کی رو سے تفسیر یا اضافہ یا اسقاط درحقیقت اپنے پہلے دعویٰ کا ابطال ہے،

لیکن اس قیاس کو چھوڑ کر ہم کو قرآن و سنت سے ان اصولوں کی صحت ثابت کرنی چاہیئے، اس کے لئے ہم اپنے دوستوں کو اپنی پہلی اور دوسری نشست کی تقریریں یاد دلاتے ہیں جن میں قرآن و سنت سے اس اصول کو ثابت کیا گیا ہے، آج کے جلسہ میں ائمہ سلف اور قدمائے اہل السنۃ کے اقوال سے دکھانا ہے کہ ان رسمی فرقوں کے پیدا ہونے سے پہلے اہل السنۃ کے کیا معنی تھے،

امام مالک بن انس اہل السنۃ کا عقیدہ بتاتے ہیں،
 الکلام فی الدین اکرمہ دلائل
 عقائد میں گفتگو کرنا ناپسند کرتا
 اہل بلد ناکرہونہ وینہون عنہ ہوں، اور ہمیشہ ہمارے شہر
 نحو الکلام فی رای جہم والقدر وما (مدینہ کے علماء اس کو ناپسند
 اشبه ذالک وما احب الکلام کرتے رہے ہیں، اور اُس سے

الآفیماتحتہ عملٌ فاما الکلام فی روکنے رہے ہیں، مثلاً جہم کی
 دین اللہ فی اللہ عزوجل فاسکوت رائے اور قدر میں گفتگو کرنا،
 احبُّ الی لاتی رأیت اهل بلدنا میں بحث و مباحثہ ان امور
 ینہون عن الکلام فی الدین الآفیماتحتہ عملٌ میں ناپسند کرتا ہوں جن کے
 تحت میں کوئی عمل نہ ہو،

(جامع بیان العلم ابن عبدالبر)

لیکن خدا کے عقائد اور خود
 خدا کی ذات میں سکوت
 میرے نزدیک پسندیدہ ہے
 کیونکہ ہم نے اپنے شہر کے علماء
 کو دیکھا ہے کہ عقائد میں
 گفتگو کرنے سے روکتے تھے
 اور ان امور میں کرتے تھے جن
 کو عمل سے تعلق ہو،

امام موصوف نے نہ صرف یہ اپنا اصول بتایا، بلکہ اپنے تمام
 پیشروں کا طریقہ بھی بتایا اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سلف کی
 زندگی کی اصلی روش، عمل تھا تخیل نہیں، وہ صرف ان امور میں
 گفتگو کرتے تھے جن پر عملاً بھی ہم کو کاربند ہونا ہے۔

امام بخاریؒ خلق افعال العباد میں سلف صالحین کا مذہب

لکھتے ہیں۔

وانهم كرهوا البحث والتقيب
عن الاشياء الغامضة وتجنبوا
اهل الكلام والحوض والنازع
الا فيما جاء فيه العلم اذ بينه
رسول الله صلى الله عليه وسلم
میں بحث و گفتگو کرنا ناپسند
کیا اور جو لوگ ان میں گفتگو
غور اور نزاع کرتے تھے ان
سے پرہیز کیا، لیکن جن مسائل
میں علم (خدا کی طرف سے)
آیہ ہے یا آنحضرت صلعم نے اس
کو بیان کر دیا ہے، اس میں
انھوں نے غور و فکر اور بحث
کی،

امام ترمذی ائمہ سنت کا اصول بتاتے ہیں،

والمذهب في هذا عند اهل
العلم من الائمة مثل سفیان
الثوري ومالك بن انس وسفيان
بن عيينه وعبد الله بن مبارك
وكيع وغيره كما اس باره
میں
وغيرهم انهم روى هذه الاشياء
وقالوا روى هذه الاحاديث
ائمہ اہل علم جیسے سفیان ثوری
مالک بن انس، سفیان بن
عیینہ، عبد اللہ بن مبارک اور
وکیع وغیرہ کا اس بارہ میں
مذہب یہ تھا کہ انہوں نے
ان چیزوں کی روایت کی

وَنُومِنُ بِهَا وَلَا يُقَالُ كَيْفُ ، و
 هَذَا الَّذِي اخْتَارَهُ أَهْلُ الْحَدِيثِ
 أَنْ يَرُدُّوا هَذِهِ الْأَشْيَاءَ كَمَا
 جَلُوتُ وَيُومِنُ بِهَا وَلَا تَفْسُرُ
 وَلَا يَتَوَهَّمُ وَلَا يُقَالُ كَيْفُ وَ
 هَذَا أَمْرٌ أَهْلُ الْعِلْمِ الَّذِينَ
 اخْتَارُوهُ وَذَهَبُوا إِلَيْهِ ،
 وَهَآئِیْ هُمْ ، وَأَنْ يَرَى إِيْمَانُ
 رُكَّهَاجَا ئُ وَأَنْ كِی تَفْسِیْرُهُ
 كِی جَا ئُ وَأَنْ وَهْمُ كِیَا جَا ئُ
 أَهْلُ عِلْمٍ كَا یِیْ مَذْهَبُ هُیْ ،
 أَوْ أَسَى كُو پَسَنْدُ كِیَا هُیْ ،

محدث ابن عبد البر قدامائے اہل سنت کا مسلک بتاتے ہیں

لَا أَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يُوصَفُ عِنْدَ
 الْجَمَاعَةِ أَهْلُ السُّنَنِ إِلَّا بِمَا
 وَصَفَ بِهِ نَفْسَهُ أَوْ وَصَفَ بِهِ
 رَسُولُهُ أَوْ اجْتَمَعَتِ الْأُمَّةُ عَلَيْهِ
 أَوْ اس كُتِبَتْ شَيْئٌ فَيَدْرِكُ بِقِيَاسِ
 اس لُئْ كُی خُدَا ئُ پَاك كَا وَصَفُ
 جَمَاعَتُ ، یَعْنِیْ أَهْلُ السُّنَنِ كُی
 نَزْدِیك وَهَیْ هُو سَكَا هُیْ جِسْ
 كُو خُو دُ خُدَا ئُ بَیَانُ كِیَا هُیْ
 یَا اس كُی رَسُو لُ نَیْ یَا تَمَامُ

ادبامعان نظر وقد نهينا عن الفكر
 فی اللہ وامرنا بالتفکر فی خلقہ
 الدال علیہ ،
 نہیں پھر قیاس یا غور و فکر
 سے وہ کیونکر دریافت کیا جا
 سکتا ہے، ہم کو خدا کی ذات
 میں فکر کرنے سے منع کیا گیا ہے
 اور اسکی مخلوقات و مصنوعات
 میں غور و فکر کا حکم دیا گیا ہے جو
 خدا کے وجود اور ہستی پر دال ہیں

امام بیہقی علمائے سنت کا متفق علیہ اصول بتاتے ہیں،
 فاما الاستواء فالمتقدمون
 لیکن عرش پر برابر ہونا، تو
 من اصحابنا رضی اللہ عنہم
 قدمائے اہل سنت اسکی تفسیر
 كانوا لا یفسرونہ ولا یتکلمون
 نہیں کرتے تھے، اور نہ اس میں
 فیہ کنحو مذہبہم فی امثال ذالک
 بحث کرتے تھے جیسا کہ ان
 (کتاب الاسماء والصفات)
 کا مذہب اس قسم کے اور
 مسائل میں بھی ہے،

دار قطنی میں تہش خراسانی کی روایت سے ایک حدیث

لہ آخر کتاب الاثر بہ، تہش گو ضعیف راوی ہے اسلئے ممکن ہے کہ یہ حدیث آنحضرت تک صحیح
 نہ ہو لیکن کم از کم اس سے اسکے زمانہ کا حال معلوم ہوتا ہے، وہ تہج تابعین کے زمانہ میں تھا۔

ہے کہ مکہ معظمہ کی مسجد خیف میں صحا ک بن زاحم، حسن بن ابی الحسن
طاؤس یمنی، مکحول شامی عمرو بن دینار مکی جو اپنے اپنے خطہ کے امام
اور مشہور محدث اور تابعی تھے جمع ہوئے اور قدر میں گفتگوئیں
شروع ہوئیں، طاؤس جو سب میں مقبول تھے بولے، خدا آپ لوگ
چپ رہے تو میں حضرت ابو درداءؓ کی حدیث آپ کو سناؤں
اُس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے،

ان الله افترض عليكم فرائض خدا نے چند باتیں فرض کی ہیں
فلا تضيعوها، وحد لكم حدودا ان کو ضائع نہ کرو اور تمہارے
فلا تغيروها ونهاكم عن اشياء لئے کچھ حدود قائم کر دیئے ہیں
فلا تنتهكوها، وسكت عن اشياء ان سے بچاؤ نہ کرو، اور چند
من غير نسيان فلا تكلفوها رحمةً باتوں سے منع کیا ہے ان سے
من ربكم فاقبلوها، باز رہو، اور بغیر بھول چوک
کے بعض باتوں سے وہ خاموش
ربان اُن میں زبردستی کر کے
کو شمش نہ کرو، خدا نے اپنی
رحمت سے ایسا کیا تو اس کو
قبول کرو

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس موقع پر جو تقریر کی ہے وہ

سننے کے قابل ہے، فرماتے ہیں،

”ان مسائل میں تاویل کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
اور نہ کسی صحابی سے صحیح طریقہ سے مروی ہے، اور نہ اس
بات کی ممانعت آئی ہے کہ ان مسائل کو بیان نہ کیا
جائے، اس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے
حکم تھا کہ جو کچھ تم پر نازل ہو وہ لوگوں کو پہنچاؤ، یہ بھی
خدا نے فرمادیا کہ الیوم اکملت لکم دینکم ”آج لے
مسلمانو! میں نے تمہارا دین کامل کر دیا“ اور باوجود
اس کے آپ ان مسائل کا ذکر نہ فرمائیں، یہ محال ہے
اور اس کی تمیز نہ ہو سکے کہ خدا کی طرف کن صفات کی
نسبت ہو سکتی ہے اور کن کی نہیں ہو سکتی، حالانکہ
آپ نے تمام صحابہ کو تاکید فرمادی تھی کہ جو لوگ آپ
کے سامنے موجود ہوں وہ آپ کے احکام ان لوگوں
تک پہنچا دیں جو موجود نہیں، یہاں تک کہ اسی بنا پر
آپ کی ایک ایک بات، ایک ایک کام، ایک ایک
حالت، اور ایک ایک واقعہ جو آپ کے سامنے ہوا،
اس کو بیان کر دیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا
اس امر پر اتفاق تھا کہ ایمان اسی طرح لانا چاہیے جس

طرح خدا چاہتا ہے۔

حافظ صاحب کا مقصود یہ ہے کہ خدا نے اپنے دین کے متعلق جو کچھ کہنا تھا وہ اپنے پیغمبر کی زبانی انسانوں تک پہنچا دیا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے جو کچھ سنا وہ اپنے بعد والوں تک پہنچا دیا، یہ مسائل اگر مذہب میں داخل ہوتے تو ضرور ان کی تعلیم ہوتی،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں،

”خدا اس سے بالاتر ہے کہ وہ عقل یا حواس سودر یافت ہو سکے، یا اس میں صفتیں اس طرح موجود ہوں کہ جس طرح عوارض جوہر میں ہو کر پائے جاتے ہیں، یا وہ اس طرح ہوں جن کو عام عقلیں ادراک کر سکیں، یا متعارف الفاظ ان کو ادا کر سکیں، یا اس ہمہ یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو بتا بھی دیئے جائیں تاکہ جہاں تک انسانیت کی تکمیل ہو سکتی ہے ہو جائے، ایسی حالت میں اس سے چارہ نہیں کہ ان صفتوں کا استعمال ان معنوں میں کیا جائے کہ ان کے نتائج اور لوازم سمجھ لئے جائیں، مثلاً ہم خدا کے لئے ”رحمت“ ثابت کرتے ہیں اس سے مقصود احسانات کا فیضان ہے، دل کی خاص کیفیت نہیں (جو انسانوں میں پائی جاتی ہے)

اسی طریقہ سے خدا کی وسعت قدرت کے اظہار کے لئے مجبوراً ہم کو وہ الفاظ استعارۃً استعمال کرنے پڑیں گے جو انسانوں کی قدرت و قوت کے لئے بولے جاتے ہیں، کیونکہ ان معانی کے ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس اس سے بہتر الفاظ نہیں، اور اسی طرح تشبیہاً بہت سے الفاظ بولے جائیں گے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان سے حقیقی معنی مراد نہ ہوں بلکہ وہ معانی جو خدا کی ذات کے لائق اور مناسب ہیں، تمام آسمانی مذہب کا اس پر اتفاق ہے کہ صفات اسی طرح پر بولے گئے ہیں اور اس پر کہ یہ الفاظ اسی طرح بولے جائیں، اور اس کے علاوہ کوئی اور بحث و کاوش نہ کی جائے اور یہی مذہب اس زمانہ کا تھا جس کی خیر و برکت کی شہادت دی گئی ہے (یعنی توحید تابعین کے عہد تک)، اس کے بعد کچھ ایسے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہو گئے جنہوں نے بغیر کسی نص قطعی اور دلیل مستحکم کے ان مسائل میں فکر و کاوش شروع کر دی۔

شاہ صاحب اپنے وصایا میں جو فارسی زبان میں ایک رسالہ ہے لکھتے ہیں :-

”اول وصیتِ ایں فیر چنگ زدن است بکتاب و
 سنت در اعتقاد و عمل، پیوستہ بندیر مرد و مشغول
 شدن و در عقائد مذہب قدماء اہل سنت اختیار
 کردن و اس را تفصیل و تفتیش آنچہ سلف تفتیش
 نکردند اعراض نمودن و بہ تشکیکات خاام معقولیان
 التفات نکردن“

شاہ صاحبؒ اپنے رسالہ تاویل الاحادیث میں فرماتے ہیں،
 ثم نشأنا من امن اس کے بعد کچھ لوگ پیدا ہوئے
 يسمون الفسهم اهل جو اپنے کو اہل سنت کہتے ہیں
 السنة والسنة منهم حالانکہ سنت ان سے براصل
 بمراحل، فتكفرومالا دُور ہے تو انہوں نے اس میں
 يعينهم، ولم يات به تکلیف سے بات کہی جس کی
 نبينهم فيا لهم من ضرورت نہ تھی، اور نہ جس کو
 مصيبة عمت فاهمت ان کے رسول لیکر آئے تھے تو
 والله المستعان۔ ہائے وہ مصیبت جو لوگوں
 میں پھیل گئی اور اس نے اندھا
 بنادیا۔

پھر رسالہ کے آخر میں فرماتے ہیں،

ولا يذهب عليك ان تم سے یہ مخفی نہ رہے کہ اس
 الطريق المستقيم في هذه مسئلہ میں اس قبیل کے تشبیہات
 المسئلة وما يشبهها من کے دوسرے مسئلوں میں جیسے
 التشبهات صاليد اللہ تعالیٰ کے لئے ہاتھ اور
 والرجل ومن العاديات پاؤں کا استعمال، اور قیامت
 وغيرها ان يمرها ومعاد وغیرہ کے مسئلوں میں
 الانسان على ظواهرها صحیح اور سیدھا طریقہ یہ ہے
 ولا يشتغل بكيفية کہ انسان ان کو ان کے ظاہر
 وجودها، ويعتقد مطلب پر رکھے، اور ان کے
 في الجملة ان ما اراد الله وجود کی کیفیت سے بحث
 درسوله حق ولا يقول نہ کرے، اور مجملایہ عقیدہ رکھے
 هذا ولم يرد هذا، و کہ ان سے اللہ اور رسول کی
 فخذ لك، ولذلك جو مراد ہے وہ حق ہے، اور نہ
 ترى النبي صلى الله عليه کہے کہ یہ مراد ہے اور یہ مراد
 وسلم ولا اصحابه نہیں ہے اور نہ اس قسم کی
 ولا التابعين لهم باتیں کریں، ہم دیکھتے ہیں کہ
 باحسان يشتغلون نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ نے
 بشئ من ذلك وانما اور نہ تابعین نے ان میں سے

جاء الاشتغال به کسی چیز سے بحث فرمائی
 من المعتزلة حين یہ بحث و مباحثہ اول معتزلہ
 استرقوا من الفلاسفة نے شروع کیا، جب انہوں نے
 واسترق اهل السنة فلسفیوں سے ان باتوں کو
 من المعتزلة، فدخل چرایا، اور اہل سنت نے ان
 فيهم اينساً، کو معتزلہ سے چرایا، تو یہ چیز ان
 کے اندر بھی داخل ہو گئی۔

اب ہم کو اپنے بیان کردہ گزشتہ اصول کلیہ کو جزئی مسئلوں
 میں دکھا کر ثابت کرنا ہے کہ قدمائے اہل سنت اور اس عہد کے اعتقاداً
 ان مسائل میں کیا تھے، جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر و برکت

کا زمانہ فرمایا ہے،

مسئلہ تقدیر یا جبر و قدر اعتقادات میں سب سے
 پہلے اسی مسئلہ میں گفتگو پیدا ہوئی، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا
 جواب نہ صرف مذہب بلکہ فلسفہ کی زبان سے بھی مشکل ہے، یہ نہ صرف
 اسلام کا مسئلہ ہے بلکہ دنیا کا کوئی مذہب اس سے خالی نہیں، اور
 درحقیقت مذہب کی روح اسی معجز العقول معما کے اندر پوشیدہ
 ہے، اس کا جواب نفیاً یا اثباتاً دعائی لہجہ میں دینا مذہب پر ایک
 خطرناک حملہ ہے،

احادیث میں ہے کہ ایک دفعہ آپ باہر تشریف لائے، دیکھا کہ کچھ اصحاب بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں، دریافت فرمایا کہ کس مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہو، عرض کی مسئلہ قدر پر، یہ سنکر آپ اس قدر براؤختہ ہوئے کہ چہرہ سرخ ہو گیا، راوی کا بیان ہے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے روئے مبارک پر انار کے دانے نچوڑ دیئے ہیں، اور فرمایا تم سے پہلی قومیں اسی میں ہلاک ہوئیں، میں تاکید کرتا ہوں کہ اس میں جھگڑا نہ کرو،

حضرت قاسم بن محمد، حضرت صدیق اکبرؓ کے پوتے، اور مدینہ کے دارالفقہ کے رکن اعظم تھے، ایک دفعہ دیکھا کہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے مسئلہ قدر میں گفتگو کر رہے ہیں فرمایا،

كُفُّوا عَمَّا كَفَّ اللَّهُ عَنْهُ ۖ
جس سے اللہ تعالیٰ خاموش رہا
تم بھی خاموش رہو۔

پس اس پر یہ عقیدہ کافی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم ازل میں ہے، اور اس کی مشیت سے ہوتا ہے،

صفات: اللہ تعالیٰ کے صفات اور اسماء حسنی کے متعلق صحیح راستہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے صفات کے دو اصول بتائے ہیں، ایک تو یہ کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے صفات بیان کئے ہیں،

۱۔ ترمذی، قدر احادیث غریب ۱۷۰ ابن سعد مجز مدینہ، تذکرہ قاسم بن محمد،

سمیع (سننے والا) اور بصیر (دیکھنے والا) وغیرہ صفات اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کئے ہیں، اس لئے وہ ان صفات حسنہ کمالیہ سے متصف ہے اور وہ صفات اس کیلئے ثابت ہیں، دوسرا اصول یہ ہے کہ لَیْسَ کَشِبِ شَيْءٍ (اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں) اس لئے ان صفات کی صورت اللہ تعالیٰ میں ایسی نہیں جو بندوں کی صفات کے مثل ہو، لَہُ سَمْعٌ لَّا کَمِثْلُنَا، وَلَہُ بَصَرٌ لَّا کَمِثْرُنَا، وہ سنا ہے مگر ہمارے سننے کی طرح نہیں، وہ دیکھتا ہے مگر ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں، بلکہ وہ اس طرح سنا اور دیکھتا ہے جو اس کی شانِ عالی کے لائق ہے، اس کی کوئی صفت بندہ میں نہیں پائی جاتی اور نہ بندہ کی کوئی صفت اس میں پائی جاتی ہے، سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ، اللہ تعالیٰ پاک ہے اس سے جس کو شرک اللہ میں شریک بتاتے ہیں۔

قرآن کو حادث و قدیم یا مخلوق و غیر مخلوق کہنا محمد رسول اللہ کے معتقدات کی فہرست میں داخل نہ تھا، اسلام کی دعوت صرف یہ ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے، اور یہ کہ اس کے من اللہ ہونے کا یقین کامل رکھا جائے،

سفیان بن عیینہ اکابر اہل سنت میں شمار ہوتے ہیں، انہوں نے نہایت غضب ناک ہو کر فرمایا،

وَحِکْمُ الْقُرْآنِ کَلَامُ اللّٰهِ کَدْ صَحِبْتُ اَفْسُوسَ تَمِیْزِ قُرْآنِ خُدا کا کلام

الناس وادرکتهم، هذا عمرو ہے "میں نے بزرگوں کی صحبتیں
 بن دینار و هذا ابن المنکدر اٹھائی ہیں، ان کا زمانہ پایا
 حتی ذکر منصور، والاعمش ہے، یہ ابن دینار یہ ابن منکدر
 ومسر بن کدام فقال یہاں تک کہ انہوں نے
 ابن عینیہ قد تکلموا فالاعتزال منصور، اعمش، مسر ابن کدام
 والرفض، والقدرة، وامروا کا بھی نام لیا، ان لوگوں نے
 باجتنا ب القوم، فما نعرف القرآن معترله، روافض، اور قد ربه
 الا کلام الله ومن قال غیر پرا اعتراضات کئے اور ان
 هذا فعليه لعنت الله سے بچنے کی تاکید کی، ہم صرف
 (جنہاء افعال العباد بخجاری) یہ جانتے ہیں کہ قرآن خدا کا
 کلام ہے اس کے سوا جس نے
 اور کچھ کہا اس پر خدا کی لعنت،

حافظ ابو احمدؒ کہتے ہیں،

ما يعرف من الصحابة رضي الله صحابہ کرام سے قرآن میں
 عنهم الخوض في القرآن. مطلق بحث منقول نہیں،

منصور بن عمار ایک محدث ہیں، ان سے کسی نے یہ مسئلہ

دریافت کیا کہ کلام الہی عین خدا ہے یا جزء خدا ہے، انہوں نے جواب

دیا "اللہ تعالیٰ ہم سب کو فتنہ سے بچائے اہل السنۃ والجماعۃ

میں سے بنائے، پیغمبروں کے بعد بندوں کے لئے خدا پر کوئی حجت نہیں ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کی نسبت یہ بحث بدعت ہے، جس میں سائل اور مجیب دونوں شریک ہیں، سائل اس میں پڑتا ہے جو اس پر فرض نہیں اور مجیب یہ تکلف وہ کرتا ہے جو اس پر فرض نہیں، خدا کے سوا میں کسی کو خالق نہیں کہتا اور اس کے سوا سب مخلوق ہے، قرآن خدا کا کلام ہے، اس کے بعد رک جاؤ، قرآن کی کوئی صفت اپنی طرف سے نہ کرو ورنہ گمراہ ہو گے۔

(جزء افعال العباد بخاری)

اسی قسم کے اقوال اور ائمہ سے بھی ثابت ہیں۔

استواء، اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے، اور ہر جگہ ہے، قرآن

مجید میں یہ دونوں باتیں مذکور ہیں۔ یہ بھی ہے کہ،

أَيْنَمَا تَوَلَّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ
ہر صہ منہ پھیرو ادھر ہی خدا ہے
یہ بھی مذکور ہے،

الْحُسْنُ عَلَى الْقَمَرِ اسْتَوَى خدا تخت پر برابر ہوا۔

بعض ائمہ ان آیتوں کے معنی یہ لیتے ہیں کہ خدا وجوداً آسمان

پر ہے، لیکن اپنے علم کی رو سے وہ ہر جگہ ہے، جمہیمہ کا اعتقاد یہ ہے

کہ خدا اپنے وجود کے لحاظ سے ہر جگہ موجود ہے۔ امام مالک سے

لے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اسکا ترجمہ جابرا کیا ہے

کس نے الرحمن علی العرش استوی کے معنی دریافت کیے، انھوں نے سن کر سر جھکایا، پھر فرمایا،

الاستواء معلوم والکیف
مجهول والايسان به واجب
والسوال عنه بدعة .
استواء کے معنی معلوم ہیں اس
کی کیفیت مجہول ہے، اس پر
ایمان لانا واجب ہے اور اس
کی نسبت بحث و سوال کرنا

بدعت ہے،

در حقیقت امام مالکؒ نے ان چند فقروں میں قدمائے اہل
السنۃ کے اصولِ کلیہ کی تعلیم فرمادی ہے، یہی وہ اصول ہے جو ہر قسم
کے ایرادات اور اعتراضات عقلی کے لئے سپر ہے، انھوں نے
اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی ہے، انھوں نے کہا کہ اگر تمہارے اعتقادات
کی بنیاد جدل و مناظرہ اور دلائل عقلی پر ہے تو بالکل ممکن ہے کہ کل
تم سے زیادہ پُر زور اور بولنے والا آدمی تمہارے سامنے آ جائے، اور
اپنے دلائل سے تمہیں مغلوب کر دے، تو کیا تم اپنا مذہب چھوڑ دو گے،
اور پرسوں اس سے زیادہ طبیعت دار اور چلتا ہوا تم سے دو بدو ہو
اور وہ کل کے دلائل کو جن کو تم قائل ہو گئے تھے پرزہ پرزہ
کر دے تو کیا پھر اپنا مذہب بھی بدل لے دو گے اور اسی طرح ہر نئے

دن کے آفتاب کے ساتھ تمہارا مذہب نکلتا دو بتا رہے گا۔

بعض شبہات کا ازالہ، یہ پورا سلسلہ مضمون پڑھ

کر ممکن ہے کہ بعض صاحبوں کو یہ شک پیدا ہو کہ اہل السنۃ مذہب کا عقل کے موافق ہونا ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔

اس سوال کے حل کرنے میں دو باتیں قابلِ لحاظ ہیں، اول یہ کہ ہم مذہب کو جن عقائد و اعمال کا مجموعہ سمجھتے ہیں ان کا اس قدر حصہ جس کو صاحبِ شریعتؐ نے ہم پر کھول دیا ہے اور جو درحقیقت مذہب ہے اس نے اس کے تمام اصول و فروع بھی ہم کو بتا دیئے ہیں اس کا ایک ذرہ خلاف عقل نہیں ہے، اس کے دلائل وہی صحیح ہیں جو خود شریعتؐ نے اپنے دعوؤں کے ساتھ پیش کئے ہیں اور وہ تمام تر عقل کے مطابق ہیں، لیکن وہ حصہ جو درحقیقت مذہب کا جز نہیں، یعنی ہمارے علمِ کلام کے وہ عناصر جو قرآن اور سنتِ صحیحہ سے ماخوذ نہیں، اور جو باہمی فرقوں کے کلامی مناظروں کی پیداوار ہیں ممکن ہے کہ وہ خلاف عقل اور مجموعہ محالات ہوں لیکن وہ درحقیقت ہمارے دین کا جز نہیں،

(۲) دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ جب ہم ایک شے کو

خلاف عقل کہنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس کے دوسرے معنی

یہ ہیں کہ عقل نے مستم طور سے ایک بات پہلے سے طے کر دی ہے جس

کے دلائل اس قدر مضبوط ہیں کہ وہ ٹوٹ نہیں سکتے، اب مذہب اس کے خلاف دوسری بات کہتا ہے جس کو مان لینا ایک ثابت شدہ قطعی مسئلہ کو باطل کر دینا ہے، لیکن ذرا غور کیجئے کہ مذہب اور عقل کے درمیان جو مسائل متنازع فیہ کہے جاتے ہیں کیا ان کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ عقل نے مضبوط اور مستحکم دلائل سے اس طرح ان کو ثابت کر دیا ہے کہ وہ قطعی ہو گئے ہیں، اور ان کے خلاف کہنا ایک ثابت شدہ مسئلہ کا انکار ہے؟ حقیقتہً ایسا نہیں ہے، اس لئے کسی شے کو **خلاف عقل** کہہ دینے میں جلدی نہیں کرنی چاہیئے، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری عقلیں اس کا فیصلہ نہیں کر سکتیں، اور یہ سچ ہے،

مشکلِ عشق نہ در حوصلہ دانشِ ماست

عقلِ این نکتہ بایں فکر خطا نتواں کرد

(۳) آخری اعتراض آپ یہ کر سکتے ہیں کہ اس اصول کے مطابق تو اسلام کے خلاف مذاہب پر بھی کوئی عقلی اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی صحت کا معیار بھی عقل نہیں ہو سکتی، لیکن ہم یہ کہیں گے کہ اسلام نے جن مسائل کی تلقین کی ہے وہ سرتاپا عقلی ہیں، اور جب ان کے مخالف یا متضاد کوئی ہدایت کسی مذہب میں ہے تو درحقیقت وہ خلاف عقل ہے اور اس کی صحت کا

جائزہ عقل ہی سے لیا جاسکتا ہے، ہمارا مقصد اصلی ایسی طرح سمجھ لیجئے۔
قرآن اور سنتِ صحیحہ نے بتا دیا ہے کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہے
اور اسی پر آپ کو اکتفا کرنا چاہیئے اور جو نہیں بتایا ہے، اس کی تشریح
اس میں زیادتی، یا اس میں کمی، بذریعہ عقل جائز نہیں، یعنی اس راستہ
پر ہم کو اپنی روشنی سے نہیں بلکہ خدا کی دی ہوئی روشنی کے سہارے
سے چلنا چاہیئے۔

(۴) آخر میں ایک اور غلطی دُور کر لینا چاہیئے، میری تفسیر سے یہ
مطلب نہ سمجھا جائے کہ عقل بیکار محض ہے، بلکہ وہ محدود العلم ہے
ہمارے حواس جو ہماری عقل کے ذرائعِ علم ہیں ان سے ہماری
عملی عقل جو معلومات حاصل کرتی ہے، ان سے بڑھ کر آگے ماورائے
محسوسات میں وہ بے کار ہے، اور یہ عقل کی تحقیر نہیں، بلکہ اس کے
علم کے دائرہ کی واقعی تحدید ہے، بصارت ایک خاص فاصلہ کے
آگے نہیں دیکھ سکتی، سماعت اپنے عمل کے لئے ایک مخصوص دائرہ
چاہتی ہے جس کے بعد وہ بے کار ہے، اسی طرح عقلِ انسانی ایک
محدود دائرہ رکھتی ہے جس کے بعد وہ بے کار ہے، اور نیز جس طرح ہر
حادثہ اپنے خاص کام کے علاوہ دوسرا کام انجام نہیں دے سکتا،
اسی طرح عقلِ انسانی بھی اپنے خاص دائرہِ عمل کے سوا دوسرا کام
انجام نہیں دے سکتی، جو شخص اس بات کا شک کی ہے کہ ہم مادیات

میں رہ کر اپنی عقل کے ذریعہ سے ماورا ئے مادہ کے حالات سے
 کیوں واقف نہیں ہو سکتے، اس کو سب سے پہلے یہ شکایت کرنی چاہیے
 کہ کھنڈ میں رہ کر ہم کو لندن کی نمائش کیوں نظر نہیں آتیں، اور
 ہندوستان میں ہم کو فرانس کے میدان جنگ کی توپوں کی آوازیں
 کیوں سنائی نہیں دیتیں؟



اہل السنۃ کے عقائد صحیحہ

عقائد کی افادیت: یہ سارے مباحث جو اوپر

گزرے۔ یہ حقیقت میں عقلی کشمکش اور ذہنی الجھاؤ کو عقل کی راہ سے سمجھانے کی کوشش ہے، حالانکہ اس کے متعلق فیصلہ ہے کہ

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں مٹا مارا

اس لئے عملى حیثیت سے ان الجھنوں میں پڑنے سے نہ کوئی فائدہ

ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے، اسی لئے اسلام نے صرف اُن عقائد پر

زور دیا ہے جو انسان کے اعمال و اخلاق و کردار پر مؤثر ہوں، جو اس

کو خیر اور نیکی کی طرف دعوت دیں، اور بُرائی۔ اور شر سے اس کو

بچائیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی توحید کا منشا یہ ہے کہ اس کے سوا نہ

کوئی نافع ہے، اور نہ ضار، نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، ہر

حالت میں اسی کو پکارنا چاہیئے، اور اسی سے غیبی مدد مانگنا چاہیئے

اس کے سوا کسی کا کوئی حقیقی ملجا و ماویٰ نہیں، وہ اپنے تمام

صفات میں ہمہ کمال ہے، تمام اوصافِ حسنہ اور اسماءِ حسنیٰ

کا وہ جامع ہے، اسی کا حکم ہے جو ساری دنیا میں جاری ہے، وہ جو

لہ از کیمیل الدین حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ،

چاہتا ہے وہ کرتا ہے، اور جس کا چلے حکم دیتا ہے، وہی گناہوں کو معاف کرتا ہے وہی غیب کا حال جانتا ہے،

غرض اپنے ان تمام اوصافِ حسنہ کی تعلیم بندہ کو اس لئے دی ہے کہ بندہ کو خدا کی معرفت حاصل ہو، اور بندہ اس کے اوصافِ جمالیہ کی بناء پر اس سے محبت کرے اور اس کے اوصافِ جلالیہ کا خیال کر کے اس سے ڈرے، اور خدا کے اچھے صفات کا عکس اپنے اندر پیدا کر سکے،

اہل سنت کے عقائد: یہ چند باتیں بطور مثال کے لکھی ہیں، اسی طرح دوسرے عقائد بھی ہیں، جن کا اثر بندہ پر کسی نہ کسی طرح پڑتا ہے، اور وہ اُن سے معرفت یا عمل کا فائدہ اٹھاتا ہے، ذیل میں ہم ان عقائد کو جو اہل سنت کے نزدیک مسلم ہیں اس غرض سے درج کرتے ہیں تاکہ عامہ مسلمان اہل سنت کے عقائدِ مسلمہ پر مطلع ہوں، اور اس سے اپنے عقیدہ کی تصحیح کریں، تاکہ ایمان صحیح و کامل نصیب ہو۔

اہل سنت کے عقائد کا سب سے مختصر مضمون تو یہ ہے،
 اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ
 مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی

معبود نہیں اور محمد اللہ کے

رسول ہیں۔

اس شہادت کے فقرہ اولیٰ کو شہادتِ توحید اور فقرہ ثانی کو شہادتِ رسالت کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ بندہ جب اللہ کے سوا اور کو معبود نہیں مانتا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول دل و جان سے تسلیم کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جس قدر احکام نازل ہوئے، ان سب کو وہ مانتا ہے،

لیکن اس اجمال کے بعد مزید تفصیل کوئی چاہتا ہے، تو وہ

یہ ہے،

آمنت باللہ وملكته وكتبه میں ایمان لایا ہوں اللہ پر
ورسلہ والیوم الآخر والقدر اور اس کے فرشتوں پر، اور
خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ . اس کی کتابوں پر اور اس کے
رسولوں پر اور اخیر دن پر، اور
اس بات پر کہ جو اچھایا بُرا ہوتا
ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی
طرف سے مقدر ہے،

بندہ جب رسولوں اور کتابوں پر ایمان لایا تو سارے صحیح
عقیدے اور اللہ تعالیٰ کے سارے احکام ان میں داخل ہو گئے،

لیکن چونکہ یہ بھی مجمل ہیں، اس لئے علماء محققین نے ان امور کو جن کو خاص طور سے خیال میں رکھنا چاہیے، کتاب و سنت سے لے کر یکجا کر دیا ہے تاکہ ہر مسلمان ان کو خوب سمجھ کر مان لے، تاکہ اس کے مطابق اس کے دین کے سارے کام درست ہو جائیں،

اول ایمان باللہ، سب سے پہلا اور سب سے اہم بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں، اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کو ان صفات کے ساتھ مانیں جن کو اللہ اور رسول نے بتایا ہے، یعنی ہم یہ دل سے مانیں اور زبان سے اقرار کریں کہ اللہ ایک ہے، وہ ہمیشہ سے ہر اور ہمیشہ رہے گا وہ کسی کا محتاج نہیں، اور ساری چیزیں اس کی محتاج ہیں، اس کی تمام صفتیں اچھی ہیں اور وہ ہر بُرائی سے پاک ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ سنتا اور دیکھتا ہے، وہ چُھپے اور گھلے ہر شے کا علم رکھتا ہے، اس کو موت نہیں آتی، اس کو نیند نہیں آتی، دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں پہلے ناپید تھیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے اور مشیت سے ان کو پیدا کیا اور وہ جب چاہے ان کو فنا کر دے، وہ کلام کرتا ہے، اس کا کوئی سا جھی اور ساتھی نہیں، اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کے ماں اور باپ ہے، اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے، وہ ان سارے جسمانی رشتوں سے پاک ہے، وہ

ساری دنیا کا بادشاہ ہے، اس کے حکم سے کوئی باہر نہیں، نہ اس کی قدرت سے کوئی چیز خارج ہے، وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے، وہی پیدا کرتا ہے، اور وہی موت دیتا ہے، وہی اپنے بندوں کو سب آفتوں سے بچاتا ہے اور وہی عزت والا ہے، بڑائی اور عظمت اور کبریائی والا ہے، گناہوں کا بخشنے والا ہے، زبردست ہے، بہت دینے والا ہے، روزی پہنچانے والا ہے جس کی روزی چاہتے تنگ کرے، جس کی چاہے فراخ کرے، جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے، جس کو چاہے پست کرے، جس کو چاہے بلند کرے۔

صفات، خالق تعالیٰ میں مخلوق کی سی کوئی صفت نہیں پائی جاتی، اور نہ خالق تعالیٰ کی سی کوئی صفت مخلوق میں پائی جاتی ہے، قرآن اور حدیث میں بعض جگہ جو ایسی باتوں کی خبر دی گئی ہے تو یا تو ان کے معنی کو اللہ کے سپرد کریں کہ وہی اس کی حقیقت جانتا ہے اور ہم بے کھود گردید کئے ہوئے ایمان اور یقین کر لیں، اور یہی بہتر ہے، یا پھر کچھ مناسب معنی اس کے لگا لے جائیں، جس سے وہ سمجھ میں آجائے، جیسا کہ علمائے متاخرین نے اختیار کیا ہے،

ایمان بالقدر، عالم میں جو کچھ بھلا بُرا ہوتا ہے سب کو اللہ تعالیٰ اس کے ہونے سے پہلے ہمیشہ سے جانتا ہے اور اپنے

جاننے کے موافق اس کو پیدا کرتا ہے، تقدیر اسی کا نام ہے،

جبر و قدر، بندوں کو اللہ تعالیٰ نے سمجھ اور ارادہ دیا جس

سے وہ گناہ اور ثواب کا کام اپنے اختیار سے کرتے ہیں، مگر بندوں کو کسی کام کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں ہے، گناہ کے کام سے اللہ تعالیٰ ناراض اور ثواب کے کام سے خوش ہوتے ہیں۔

تکلیف مالا یطاق، اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کسی ایسے

کام کے کرنے کا حکم نہیں کیا جو بندوں سے نہ ہو سکے،

عدم وجوب اصلاح، کوئی چیز خدا کے ذمہ ضروری نہیں

وہ جو کچھ مہربانی کرے اس کا فضل ہے،

ایمان بالرسالت، اللہ تعالیٰ نے بندوں کو سمجھانے اور

سیدھی راہ بتانے کو بہت سے پیغمبر بھیجے، ان پیغمبروں کو خدا نے

اپنے ارادہ اور پسند سے برگزیدہ کیا، وہ سب گناہوں سے پاک ہیں

ان آنے والے پیغمبروں کی پوری گنتی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے،

معجزات، ان کی سچائی بتانے کو اللہ تعالیٰ نے ان کے

ہاتھوں ایسی مشکل باتیں کرائیں جو اور لوگ نہیں کر سکتے، ایسی

باتوں کو معجزہ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے ذریعہ

اپنی ہدایتوں، تعلیموں اور حکموں پر مطلع فرمایا، اور ان پیغمبروں نے

ان کو سن کر اپنے زمانہ کے لوگوں تک پہنچایا، اس کو وحی کہتے ہیں

ان پیغمبروں میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام
 تھے اور سب سے آخر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی
 درمیان ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا شخص
 نبوت پر سرفراز ہو کر نہیں آئے گا، اور جو ایسا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہی
 نبوت و رسالت کا منصب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات
 پر ختم ہو گیا، قیامت تک جتنے آدمی اور جن ہوں گے سب کے آپ
 ہی پیغمبر ہیں،

ہاں پیغمبروں میں سے بعضوں کا مرتبہ بعضوں سے بڑا ہے سب
 میں زیادہ مرتبہ ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔
 معراج ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جاگتے
 میں جسم کے ساتھ مکہ سے بیت المقدس تک، اور وہاں سے ساتوں
 آسمانوں پر، اور وہاں سے جہاں تک منظور ہوا پہنچایا، اور پھر واپس
 مکہ میں پہنچا دیا، اس کو معراج کہتے ہیں۔

ایمان بالملائکہ، اللہ تعالیٰ نے کچھ مخلوقات کو نور سے
 پیدا کر کے ان کو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ کیا ہے، ان کو فرشتے
 کہتے ہیں،

اللہ تعالیٰ نے تدبیر عالم کے بہت سے کام اپنے ارادہ اور
 مشیت سے کسی مصلحت سے ان کے سپرد کئے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ

کے احکام بجالاتے ہیں، اور اپنے سپرد شدہ کاموں کی انجام دہی میں کبھی سرتابی یا نافرمانی نہیں کرتے، وہ نہ انسانوں کی طرح کھاتے اور پیتے ہیں، اور نہ انسانوں کی طرح مرد اور عورت ہیں،

شیاطین و جنات، اللہ تعالیٰ نے کچھ مخلوقات آگ

سے پیدا کئے ہیں اور ان کو ہماری نظروں سے پوشیدہ کیا ہے

ان کو جن کہتے ہیں، ان میں نیک و بد سب طرح کے ہوتے ہیں، ان

کے اولاد بھی ہوتی ہے، ان سب میں سب سے زیادہ مشہور

شریر ابلیس یا شیطان ہے، جو لوگوں کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے اور ان

کے دلوں میں دوسو سے ڈالنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے،

اولیاءِ مسلمان جب خوب عبادت کرتا ہے، اور اللہ

تعالیٰ کے حکموں پر پوری طرح چلتا ہے، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے طور طریقہ پر عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو محبوب

رکھتے ہیں، ایسے شخص کو ولی کہتے ہیں،

کرامت ایسے شخص کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ بعض ایسی

باتیں ظاہر کرتا ہے، جو اور لوگوں سے نہیں ہو سکتیں، تو ایسی باتوں کو

کرامت کہتے ہیں، ولی خواہ کتنا ہی بڑا ہو جائے مگر نبی کے برابر

نہیں ہو سکتا، وہ خدا کا کیسا ہی پیارا ہو جائے مگر جب تک اس

کے ہوش و حواس درست ہیں شرع کا پابند رہنا فرض ہے، نماز

روزہ، اور کوئی فرض عبادت معاف نہیں ہوتی، اور جو گناہ ک
 باتیں ہیں وہ اس کے لئے درست نہیں ہو جاتیں،
 جو شخص شرع کے خلاف ہو وہ خدا کا دوست یا دلی نہیں
 ہو سکتا،

کشفِ اولیاء اور لیائے الہی کو بھید کی بعض باتیں سوتے
 یا جاتے میں معلوم ہو جاتی ہیں، ان میں جو شرع کے موافق ہو وہ
 قبول ہے، اور اگر خلاف ہے تو رد ہے،

بدعت، اللہ اور رسولؐ نے دین کی سب ضروری باتیں
 قرآن و حدیث میں بندوں کو بتادی ہیں، اب دین میں کوئی نئی
 بات نکالنا جو دین میں نہیں، درست نہیں، ایسی نئی بات کو بدعت
 کہتے ہیں، بدعت بہت بڑا گناہ ہے،

اجتہاد، دین کی بعض ایسی باتیں جو صریحاً قرآن و حدیث
 میں بعینہ مذکور نہیں ہیں، دین کے بڑے بڑے عالموں نے جن کو
 قرآن و حدیث کے علم میں کمال تھا، اپنے علم و فہم کے زور سے
 قرآن و حدیث سے نکال کر بیان کی ہیں، وہ بدعت نہیں ہیں، ایسے
 عالموں کو مجتہد کہتے ہیں، جن میں سے چار مشہور ہیں، امام ابو حنیفہ
 ۱، امام شافعی ۲، امام مالک ۳، امام احمد بن حنبل،

ایمان بالکتاب، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر مختلف

زبانوں میں چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں اتاریں، جن میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے ذریعہ سے اُن کی امتوں کو اپنے احکام اور ہدایات سے مطلع فرمایا، ان میں چار کتابیں بہت مشہور ہیں، تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی، زبور جو حضرت داؤد علیہ السلام کو ملی، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور قرآن مجید ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو، یہ قرآن مجید آخری کتاب ہے اب اس کے بعد کوئی آسمانی کتاب نہیں آئے گی، اس کتاب کی کس ادنیٰ بات کے بھی انکار کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے، قیامت تک قرآن کا حکم چلتا رہے گا، دوسری آسمانی کتابوں کو ہمراہ لوگوں نے بہت کچھ بدل ڈالا، مگر قرآن مجید کی نگہبانی کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے، اس کو کوئی بدل نہیں سکتا،

صحابی، ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جس مسلمان

نے دیکھا اس کو صحابی کہتے ہیں، ان کی اعلیٰ قدر مراتب بڑی بڑی بزرگیاں آتی ہیں، ان سب سے محبت اور اچھا لگنا رکھنا چاہیئے اگر کوئی لڑائی جھگڑا ان کا سننے میں آئے تو اس کو ان کی بھول چوک سمجھے، بُرائی نہ کرے، ان سب میں بڑھ کر چار صحابی ہیں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، پیغمبر صاحب کے بعد ان کی جگہ پر بیٹھے، اور دین کا بند و بست کیا، اس لئے یہ اول خلیفہ کہلاتے

ہیں تمام امت میں یہ سب سے بہتر ہیں، ان کے بعد ۲ حضرت
 عمر رضی اللہ عنہ، یہ دوسرے خلیفہ ہیں، ان کے بعد ۳ حضرت عثمان
 رضی اللہ عنہ، یہ تیسرے خلیفہ ہیں، ان کے بعد ۴ حضرت علی رضی اللہ
 تعالیٰ عنہ، یہ چوتھے خلیفہ ہیں،

اہل بیت، پیغمبر صاحب کی اولاد اور بیبیاں سب تعظیم
 کے لائق ہیں، اولاد میں سب سے بڑا رتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ
 عنہا کا ہے اور بیبیوں میں حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ
 رضی اللہ عنہما کا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں تمام
 مسلمانوں کی مائیں ہیں، اسی لئے ان کا احترام کریں، اور اہل بیت
 سے محبت رکھیں،

کفر کی بعض باتیں، ایمان جب درست ہوتا ہی
 کہ اللہ اور رسول کو سب باتوں میں سچا سمجھے، اور ان کو دل سے
 مانے، اور زبان سے اس کا اقرار کرے، اور عمل سے ظاہر کرے،
 اور اللہ و رسول کی کسی بات میں شک کرنا، یا اس کو جھٹلانا، یا اس
 میں عیب نکالنا، یا اس کے ساتھ مذاق اڑانا، ان سب باتوں
 سے ایمان جاتا رہتا ہے،

قرآن و حدیث کے کھلے کھلے مطلب کو نہ ماننا، اور ایچ پیج
 کر کے اپنے مطلب بنانے کو معنی گھڑنا بد دینی کی بات ہے، گناہ

کو حلال سمجھنے سے ایمان جاتا رہتا ہے، گناہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو جب تک اس کو بُرا سمجھے اس سے ایمان نہیں جاتا، البتہ کمزور ہو جاتا، اور اللہ تعالیٰ سے نڈر ہو جانا، یا اس کی رحمت سے مایوس ہو جانا کفر ہی کسی سے غیب کی باتیں پوچھنا اور اس کا یقین کرنا کفر ہے، البتہ نبیوں کو وحی سے اور ولیوں کو کشف والہام سے، اور عام لوگوں کو نشانیوں سے کوئی بات معلوم ہو سکتی ہے، کسی کا نام لے کر کافر کہنا یا لعنت کرنا بڑا گناہ ہے، ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ظالموں پر لعنت جھوٹوں پر لعنت، مگر جن کا نام لے کر اللہ و رسولؐ نے لعنت کی ہے یا ان کے کفر کی خبر دی ہے، ان کو کافر و ملعون کہنا گناہ نہیں ہے، گناہ کے ارتکاب سے آدمی کافر نہیں ہو جاتا، صرف گنہگار ہوتا ہے، ایسا شخص توبہ کرے، اور اللہ تعالیٰ سے دل سے معافی چاہے تو، اللہ تعالیٰ معاف فرما سکتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو توبہ کئے بغیر بھی وہ معاف کر سکتے ہیں،

بچھلے دن پر ایمان، اس سے یہ مقصد ہے کہ موت کے بعد سے لے کر قیامت تک اور قیامت کے بعد جنت اور دوزخ کے جو احوال اور واقعات قرآن و حدیث سے ثابت ہیں، ایک مسلمان کا فرض ہے کہ دل سے ان کو صحیح یقین کرے اور زبان سے ان کا اقرار کرے، ان میں کسی ایسے واقعہ کا انکار جو قرآن اور حدیث

سے ثابت ہے کفر ہے، اور اس میں ایسا پیچ کر کے مطلب نکالنا جو عبارت کے صاف و صریح مطلب کے خلاف ہو بد دینی ہے،

جس وقت انسان پر موت کے آثار طاری ہوتے ہیں اس پر برزخ کے احوال منکشف ہونے لگتے ہیں، اب یہ توبہ کا وقت نہیں، اس وقت توبہ قبول نہیں ہوتی،

موت جس کے مقدر فرشتے مردہ کے جسم سے رُوح نکالتے ہیں، نیک لوگوں کی آسانی سے نکلتی ہے، اور بُرے لوگوں کی بڑی سختی اور تکلیف سے نکلتی ہے، اور اسی وقت سے جزا اور سزا کا معاملہ شروع ہو جاتا ہے،

جب آدمی مر جاتا ہے اگر دفن کیا جائے تو گاڑنے کے بعد اور اگر دفن نہ کیا جائے تو جس حال میں ہو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ تیرا پروردگار کون ہے، تیرا دین کیا ہے، اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں، اگر وہ ایمان دار ہو تو ٹھیک ٹھاک جواب دیتا ہے، پھر اس کے لئے سب طرح کا چین ہے، اور فرشتہ اس سے کہتا ہے کہ آرام کی نیند سو جا، اور اگر وہ مردہ ایمان سے محروم ہو تو وہ ہر سوال کے جواب میں یہی کہتا ہے کہ مجھے خبر نہیں، تو پھر اس کے ساتھ سختی اور سزا کا معاملہ شروع ہو جاتا ہے،

بعضوں کو اللہ تعالیٰ اس امتحان سے معاف فرمادیتا ہے مگر یہ باتیں مردے کو معلوم ہوتی ہیں، ہم لوگ نہیں دیکھ سکتے، جیسا سوتا ہوا آدمی خواب میں سب کچھ دیکھتا ہے، اور آرام اور تکلیف اٹھاتا ہے، اور اس کے پاس بیٹھا ہوا دوسرا جاگتا آدمی اس سے بالکل بے خبر رہتا ہے،

مردے کے لئے دعا کرنے سے یا کچھ خیرات دے کر بخشنے سے اس کو ثواب پہنچتا ہے، اور اس سے اس کو فائدہ پہنچتا ہے،

خدا اور رسول نے قیامت کی جتنی نشانیاں بتائی ہیں، سب ضرور ہونے والی ہیں، امام مہدی علیہ السلام ظاہر ہوں گے، اور خوب انصاف سے بادشاہی کریں گے، کانا دجال نکلے گا، اور دنیا میں بہت فساد مچائے گا، اس کے مار ڈالنے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے اور اس کو مار ڈالیں گے،

یا جوج ماجوج دوز بردست قومیں ہیں، وہ تمام روئے زمین پر پھیل پڑیں گی، اور فساد برپا کریں گی، پھر خدا کے قہر سے ہلاک ہوں گی، ایک عجیب طرح کا جانور زمین سے نکلے گا، اور آدمیوں سے باتیں کرنے لگے گا، آفتاب مغرب کی طرف سے نکلے گا، اور قرآن مجید اُٹھ جائے گا، اور چند روز میں تمام مسلمان ہلاک ہو جائیں گے، اور تمام دنیا کافروں سے بھر جائے گی، کوئی اللہ کا نام لیوا باقی نہیں

رہے گا۔ اور بہت سی باتیں ہوں گی، جب ساری نشانیاں پوری ہو جائیں گی تب قیامت کا سامان شروع ہوگا۔

قیامت، ایک فرشتہ جس کا نام اسرافیل ہے، خدا کے حکم سے صور پھونکے گا، جس سے تمام زمین و آسمان اور آفتاب اور تارے اور پہاڑ سب ٹوٹ پھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے تمام مخلوقات مرجائیں گی، اور جو مریچے ہیں، ان کی روئیں بے ہوش ہو جائیں گی، مگر اللہ تعالیٰ کو جن کو بچانا منظور ہوگا، ان کو بچالیں گے ایک مدت اسی کیفیت پر گزر جائے گی، پھر جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا کہ تمام عالم دوبارہ پیدا ہو، دوسری بار صور پھونکا جائے گا، اس سے پھر سارا عالم موجود ہو جائے گا، مردے زندہ ہو جائیں گے، اور قیامت کے دن میدان میں سب اکٹھے ہو جائیں گے، اور وہاں کی تکلیفوں سے گھبرا کر سب پیغمبروں کے پاس سفارش کرانے جائیں گے، سب بھلے بُرے عمل لئے جائیں گے، ان کا حساب ہوگا، اعمال تو لئے جائیں گے جن کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ جنت میں جائیں گے جن کی برائیوں کا پلہ بھاری ہوگا، وہ دوزخ کے مستحق ہوں گے، اور جن کی نیکیاں اور بریاں برابر ہوں گی، اللہ تعالیٰ جو چاہے گا ان کے ساتھ معاملہ کرے گا نیکیوں کا نامہ اعمال دابنہ ہاتھوں میں اور بُروں کا نامہ اعمال بائیں ہاتھوں میں دیا جائے گا،

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو حوض کوثر کا پانی پلائیں گے، جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا، لوگوں کو پل صراط پر سے چلنا ہوگا، جو نیک لوگ ہوں گے وہ اس پار سے اُس پار ہو کر بہشت میں پہنچ جائیں گے، اور جو بد ہیں وہ اس پر سے دوزخ میں گر پڑیں گے،

دوزخ، پیدا ہو چکی ہے، اور اس میں سانپ، بچھو، آگ

اور طرح طرح کا عذاب ہے، دوزخیوں میں جن میں ذرا بھی ایمان ہوگا وہ اپنے اعمالِ بد کی سزا بھگت کر پیغمبروں، اور بزرگوں کی سفارش کے بعد حسبِ مشیتِ الہی بہشت میں داخل ہوں گے، خواہ وہ کتنے ہی بڑے گناہ گار ہوں اور جو کافر و شرک ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور ان کو موت بھی نہ آئے گی،

شفاعت، انبیاء علیہم السلام اور بزرگ اللہ تعالیٰ کی مرضی

سے ان گناہگار مومنوں کے حق میں جن کے باب میں مشیتِ الہی کا اشارہ ہوگا، شفاعت کریں گے، اور اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائیں گے،

بہشت، پیدا ہو چکی ہے، اور اس میں باغ، نہریں، میوے

عالی شان مکانات، سایہ دار درخت، اور طرح طرح کے ایسے چین اور نعمتیں ہیں، جن کا تصور بھی دنیا میں نہیں ہو سکتا، اور یہ سب نعمتیں

لازوال ہوں گی، یعنی نہ اللہ تعالیٰ ان کو پھینکے گا، نہ وہ فنا ہوں گی، بہشتیوں کو ہمیشہ کی زندگی حاصل ہوگی، وہاں ان کو نہ کسی کا غم ہو گا اور نہ خوف، اور نہ موت آئے گی،

اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ چھوٹے گناہ پر سزا دیدے یا بڑے گناہ کو محض اپنی مہربانی سے معاف کر دے، اور بالکل اس پر سزا نہ دے،

جن لوگوں کے نام لے کر اللہ و رسول نے بہشتی ہونا بتا دیا، ان کے سوا کسی کے بہشتی ہونے کا یقینی حکم ہم نہیں لگا سکتے، البتہ اچھی نشانیاں دیکھ کر اچھا گمان رکھنا، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھنا ضروری ہے، بہشت میں سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول، اور اللہ تعالیٰ کے دیدار کی نعمت ہے جو بہشتیوں کو بہشت میں نصیب ہوگی، جس کے سامنے تمام نعمتیں بیچ معلوم ہوں گی،

دنیا میں جاگتے ہوئے ان آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا، عمر بھر کو کیسا ہی بھلا بُرا ہو، مگر جس حالت میں موت آئے اور جس حالت پر خاتمہ ہو، اس کے موافق جزاء اور سزا ہوگی،

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَقَّاعِ الْآبْرَارِ

سُز سُز سُز

ضمیمہ

اُن فلسفیانہ اصطلاحات کی مختصر تشریح
جو اس بے نظیر رسالہ میں آگئے ہیں

از

پیشہ دار مفتخر بہ نسبت حضرت سلیمانؑ

غلام محمد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جوہر

وہ شے جو بالذات قائم ہو یعنی اپنے قیام میں دوسرے کی محتاج نہ ہو
جیسے دیوار اور سایہ کی مثال میں دیوار "جوہر" ہے کہ وہ اپنے قیام میں سایہ کی
محتاج نہیں، سایہ رہے نہ رہے وہ اپنی جگہ کھڑی رہے۔

عرض

وہ شے جو اپنے قیام میں دوسرے کی محتاج ہو مثلاً اوپر کی مثال میں
سایہ "عرض" ہے کہ وہ اپنے قیام میں دیوار کا محتاج ہے دیوار نہ ہو تو اس کا وجود
عدم ہے۔

عینیت

دو مضمونوں یا یوں کیے کہ دو چیزوں کا مصداق ہر طرح سے ایک ہونا کہ ان میں کسی قسم کا فرق نہ ہو سکے "عینیت" کہلاتا ہے۔ مثلاً زید اور ذات زید۔

غیریت

دو چیزوں میں سے کسی ایک کا دوسرے کے بغیر موجود ہو سنا "غیریت" کہلاتا ہے۔ جیسے ذات باری تعالیٰ اور مخلوقات، اگر کو مخلوق بغیر ذات باری کے موجود نہیں ہو سکتی مگر ذات باری تو بغیر مخلوق کے بھی موجود ہو سکتی ہے، چنانچہ مخلوق کی ایجاد سے پہلے بھی وہ موجود تھی اور مخلوق کو فنا کر کے بھی موجود رہے گی، پس مخلوق اور خالق ہیں "غیریت" پائی جاتی ہے۔

لَا عَيْنَ وَلَا غَيْرَ

مذکورہ بالا تعریف غیریت و عینیت کے اعتبار سے جب ذات حق اور اسکی اپنی صفات کو دیکھا جائے تو یہاں نہ عینیت ہی ثابت ہوتی ہے نہ غیریت۔ عینیت تو اس لئے نہیں کہ صفات، ذات سے الگ اور زائد ہیں اور غیریت اسلئے نہیں کہ ذات اور صفات میں سے ایک بھی چیز ایسی نہیں جو دوسرے کے بغیر پائی جاسکے، صفات بغیر ذات کے اسلئے موجود نہیں ہو سکتیں کہ وہ ذات کے تابع ہیں اور تابع کا اپنے متبوع کے بغیر یا ایا جانا محال ہے اور ذات بغیر صفات کے اسلئے پائی نہیں جاسکتی کہ ذات کا صفات کمال سے خالی ہونا

لازم آئے گا جو محال ہے پس دونوں لازم و ملزوم ہوئے۔ اسی کو لایین و لا غیر کہتے ہیں یعنی صفات الہیہ نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات ہیں۔

جبر

یہ صرف فعل کی تخلیق میں بلکہ ارادہ فعل میں بھی بندہ کا خود کو غیر محتار ماننا "عقیدہ جبر" ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے سارا نظام شریعت اور قانون جزا و سزا باطل ٹھہرتا ہے یہ صریح گمراہی اور اسلام سے دوری ہے۔

قدر

یہ صرف ارادہ فعل میں بلکہ اپنے ہر فعل کی تخلیق میں بندہ کا خود کو مختار ماننا "عقیدہ قدر" ہے۔ یہ بھی قرآن کے خلاف ہے کیونکہ قرآن بندہ کو نہیں بلکہ اللہ کو افعال کا خالق قرار دیتا ہے، (بندہ محض کا سبب افعال ہے)۔ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمُرُونَ

(یعنی اللہ نے پیدا کیا تمہیں بھی اور تمہارے افعال کو بھی) عقیدہ قدر بھی نہ صرف غیر اسلامی بلکہ عقل و مشاہدہ کے اعتبار سے بھی ضحکہ خیز ہے کیونکہ یہ تو رات دن کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ بندہ اپنے کتنے ہی ارادوں میں ناکام اور حسرت زدہ رہ جاتا ہے۔

الْجُزْءُ الَّذِي لَا يَتَجَرَّى

لفظی معنی تو یہ ہیں کہ ایسا جزو جس کی مزید تقسیم ناممکن ہو اور اصطلاح

میں جزو لا تجزئ جس کو جوہر فرد یا نقطہ جوہرہ بھی کہتے ہیں، ایسا ذی وضع جوہر ہے جس کی تقسیم خواہ وہ کسری (یعنی عملی تقسیم) ہو یا وہی یا فرضی کسی نوعیت کی بھی تقسیم کو وہ جوہر قبول نہ کرے۔ تسکین ان اجزاء سے جسم کو درگہ بتلاتے ہیں اور فلاسفہ اُن کے برعکس اس کو باطل قرار دیتے ہیں۔

طفرہ

لغوی معنی چھلانگ لگانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس سے مراد ایک جسم کا مسافت اور اجزائے مسافت کو اس طرح طے کر کے آخری حد پہنچ جانا ہے کہ مسافت کے درمیان حصوں سے اور ان کے محاذ و مقابل سے اس کو گزرنا نہ پڑے نظام معتزلی کے سوا فلاسفہ میں کوئی گروہ بھی اس کا قائل نہیں۔

رؤیت

آنکھ سے دیکھنا رؤیت کہلاتا ہے اور قلب سے دیکھنا رؤیتِ قلبی یا رؤیت علمی کہلاتا ہے۔

استطاعت مع الفعل

"استطاعت" ایک حقیقت ہے جوہر جاندار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے اور اسی سے اختیاری افعال سرزد ہوتے ہیں اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قدرت حاصل رہتی ہے۔ معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ ایک جاندار میں یہ استطاعت فعل کے پہلے ہی سے موجود رہتی ہے، لیکن اشاعرہ اس کے برعکس اس بات کے قائل ہیں کہ استطاعت پہلے سے موجود نہیں رہتی بلکہ عین فعل کے وقت ملتی رہتی ہے اسی کو وہ "استطاعت مع الفعل" سے تعبیر

کرتے ہیں۔ تم

مُفکّر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی چند اہم شاہکار تصنیفات

تاریخ دعوت و عمریت مکمل	نبی رحمت مکی
مسلم دنیا کی اسلامیت مغرب کی کشمکش	پڑانے چپڑا غصیل
انسانی دنیا پر مسلمانوں کی خروج و زوال کا اثر	نفوس اقبال
منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین	ارکان اربعہ
دنیا کے کابل سے دیباے پر ٹوٹ تک	کاروان مدیتہ
جس ایمان کی بہت آرائی	قادیانیت
حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب	ذکر خضر
معتزہ کراہیمان و ماتریت	تعمیر انسانیت
نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں	صحبتہ با اہل دل
عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح	حدیث پاکستان
مغرب کے کچھ صاف صاف باتیں	پانچا سٹراغ زندگی
تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک	اصلاحیات

ناشر - فضل ربی ندوی — فون - ۶۱۱۸۱۷
مجلس نشریات اسلام ناظم آباد منیشن - ۱ کے - ۲ ناظم آباد کراچی ۱۸